ایک محبت سو افسانے

اشفاق احمد



صاحب جی کے نام

ترتیب

تَوبہ	۷
فہیم	۱۷
رات بِیت رہی ہے	۳۲
تلاش	۴۱
سَنگ دِل	۵۷
مِسکن	۷۲
شب خُون	۸۰
توتا کہانی	۱۰۸
عجیب بادشاہ	۱۱۸
بندرابن کی کنج گلی میں	۱۳۲
بابا	۱۵۰
پناہیں	۱۷۶
اُمّی	۱۹۵

توبہ

میرے اِس طرح ایک دم سگرٹ چھوڑ دینے پر سبھی حیران ہیں اور جب کوئی مجھ سے اس کی وجہ پوچھتا ہے تو آپ ہی کہیے میں کیا جواب دُوں۔ یہی نا کہ مضر چیز تھی چھوڑ دی۔

جب میں نے شارعِ عام میں سگرٹ پینے شروع کر دیے تو امّی نے دس دس کے دو نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر کہا "لے آج سے توبہ کر کہ آئندہ سگرٹ پیوں تو اپنی امّی کا خون پیوں۔" میں نے نوٹ جیب میں ڈال لیے۔ کان کھجایا۔ ناک صاف کی۔ گلے کی خراش دُور کر کے امّی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور توبہ کر لی۔ انھوں نے فرطِ محبت سے میری پیشانی چُوم لی۔ وہ میری صحت کے متعلق ہر وقت پریشان رہتی تھیں۔

دوسرے دن جب وقت دیکھنے کے لیے انہوں نے میرے کوٹ کی غلط جیب میں ہاتھ ڈال دیا جہاں بجائے فیورلیوبا کے ولز کی ایک ڈبیا پڑی تھی تو میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف مُنہ کر لیا۔ جسم پر پسینے کی ہلکی سی یورش ہوئی۔ اور دس دس کے دو نوٹ اور ایک بوسہ میرے ماتھے پر "اینٹی فلوجسٹین" کے پلستر کی طرح چمٹ گئے۔ امّی نے کہا "پورے دس" اور ابا جی لفافے پر پتہ لکھ کر بولے۔ "لے بھئی تیرے ساتھ ایک سودا کرتے ہیں اعجاز۔" ——— "کیا؟" میں نے پھر کروٹ بدلی ——— "تو یہ سگرٹ پینا چھوڑ اور اس کے عوض جو انعام چاہتا ہے ہم سے لے۔ مگر ہو ہماری بساط میں۔" امّی کا چہرہ دم بھر کے لیے متغیّر ہوا۔

پھر انہوں نے رُوئی کی ایک چھوٹی سی پھریری "پین کلر" سے تر کر کے داڑھ میں رکھ لی اور کروشیے سے دبانے لگیں۔ وُہ نو آموز جواری تھیں۔ کل ہی انہوں نے بیس روپیہ کا داؤ ابّا سے پوچھے بغیر لگایا تھا اور ہار گئی تھیں۔ "سی سی" کرتے ہوئے وہ اپنی ہار بھی پھریری کے ساتھ کروشیے کی مدد سے دبانی رہیں۔

"مجھے منظور ہے۔" میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
انہوں نے سگرٹ سُلگایا اور دیا سلائی کی بُجھی ہوئی تیلی کان میں پھیر کر بولے۔
"تو بتا پھر؟"
"سائیکل لے دیجیے۔" مجھے اُس کی سخت ضرورت تھی
"مگر تیرے پاس ہے جو" وُہ حیران رہ گئے۔ جیسے میں اُسے گروی رکھ آیا ہُوں۔
"وُہ کوئی سائیکل ہے۔" میں نے اپنے چہرے پر طنز اور حقارت کی ساری علامات پیدا کر کے کہا۔ "چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پھٹتے ہوئے بموں کو لکڑی سے پیٹ رہا ہو۔"
"تو پھر؟" ابا جان مسکرائے۔
"کہہ جو دیا نئی لے دیجیے۔ اب میں اس سائیکل پر جاتا ہوا اچھا لگتا ہوں کیا؟ بی۔ایس اے سب سے اچھا ماڈل ہے۔ خوبصورت کا خوبصورت اور مضبوط کا مضبوط۔ میں تو وہی لوں گا ــــــ باقی سب بکواس ہے۔ ہے نا ابّا جی" وہ خود بھی بی۔ایس۔اے کو پسند کرتے تھے۔ میں نے تیر چھوڑا۔ "یا ڈیل کا ریچی۔"
"مگر آج کل؟ ان دنوں؟ ــــــ" وہ سوچتے ہوئے بولے۔ میں درپے ہو گیا۔
گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اچھا مِل جائے گی۔ مگر اس شرط پر کہ پھر کبھی سگرٹ کو ہاتھ تک نہ لگاؤں۔ ابا جان کو اپنے سگرٹوں سے کتنا پیار تھا۔ ان کو میری دست بُرد سے بچانے کے لیے ایک عدد بی۔ایس۔اے سائیکل رشوتًا دی جا رہی تھی۔ ابا جان کو میری صحت سے زیادہ اپنے سگرٹوں کی فکر تھی جو آئے دن ان کے ڈبے سے اغوا کر لیے جاتے تھے۔ جب تک سائیکل گھر نہ پہنچ گئی ہم نے سگرٹوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اسی ایک خیال میں مگن دل کو تسلی دیا کیے۔ نشہ کی طلب ہوتی تو ٹھنڈے پانی کے دو چار گلاس حلق میں انڈیل لیتے۔ اس سے تسکین بھی ہوتی اور تکلیف بھی اور جس دن بندوق مارکہ سائیکل ہمارے ہاتھ آئی تو سڑک پر چکر لگاتے اس کی "ٹرائی" لینے پانڈے بھیّا کی دکان پر پہنچ کر چپکے سے کونڈر کی ایک پیاکوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ دل کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ مگر دل کا کیا ہے۔
"وہ دھڑکتا ہی رہتا ہے آہستہ نہ سہی ذرا تیز سہی۔

نوحۂ غم اور نغمۂ شادی دونوں ہنگامہ پرور چیزیں ہیں اور ہم اس وقت نغمۂ شادی والے ہنگامے کو اپنائے ہوئے تھے۔ دونوں بھائیوں کی شادی ایک ہی جگہ ایک ہی وقت ہو رہی تھی۔ گھمسان کا رن تھا۔ خوب غل غپاڑہ مچا۔ ہر کوئی نفسا نفسی اور آپا دھاپی کا شکار ہو گیا۔ سامنے کے میدان میں برات کے لیے شامیانہ نصب کیا گیا تھا۔ اینٹیں جوڑ کر غسل خانے اور موتریاں تیار کی گئیں۔ رونق بڑھانے کے لیے رنگ برنگی جھنڈیاں اور نیلے پیلے بلب لگا رکھے تھے۔ ہر دروازے پر سنہرے حرفوں والا "ویلکم" کا بورڈ بادلِ ناخواستہ لٹک رہا تھا اور مرے پر سو دُرّے یہ کہ اس شور میں ایک بگڑا ہوا لاؤڈ سپیکر بھی اسی طرح کھپا دیا گیا تھا جیسے دیوالی کے پٹاخوں میں کسی بہت ہی بھونکنے والے کتے کو پٹہ ڈال کر باندھ دیا ہو۔

مجھے جس کمرے میں جگہ ملی وہ ایک جعفری تھی۔ گھر کے بیرونی برآمدے کے آخری کونے میں۔ وہاں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک کی اور گنجائش تھی۔ مگر یہ تیسری چارپائی بچھ نہ سکتی تھی، صرف گنجائش ہی گنجائش تھی۔ کیونکہ اس خالی جگہ میں اس قسم کی متعدد چیزیں پڑی تھیں جو اُٹھائی نہ جا سکتی تھیں یا جن کے سمیٹنے پر کوئی دھیان ہی نہ دیتا تھا۔ مثلاً پرانی چارپائیوں کا بان، ٹوٹے ہوئے ڈبل، اُکھڑا ہوا چرخہ، بگڑا ہوا اسٹو، لیمپ، برف جمانے والی مشین کے چند حصے۔ ایسی چیزیں نہ تو گھر میں رکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہی باہر پھینک سکتے ہیں۔ جعفری کے علاوہ ان کے لیے کوئی اور جگہ موزوں نہیں ہو سکتی۔ جعفری نہ گھر ہوتی ہے نہ باہر۔ اور کچھ انہی چیزوں کا سا حال ہمارا تھا۔ میرے ساتھ ایک تھانے دار صاحب بھی تھے۔ یہ ہمارے ساتھ برات میں آئے تھے یا لڑکی والوں کے کوئی رشتہ دار تھے مجھے اس کا علم نہیں۔ بہر حال اُن کا بستر دوسری چارپائی پر لگا دیا گیا۔ مگر اس بستر کو اُن کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ کھونٹی پر وردی لٹکا کر وہ ایسے غائب ہوئے کہ ان کی آمد کا یقین ہی نہ ہوتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کھونٹی پر وردی کہیں سے آ کر چمگادڑ کی طرح خود بخود لٹک گئی ہو۔

ساتھ والے کمرے کی دو کھڑکیاں جعفری میں کھلتی تھیں۔ یہاں دونوں دلہنیں مانجھے بیٹھی تھیں۔ کبھی کبھار ہلکی سی کھسر پھسر یا دبی دبی ہنسی کی آواز اس کمرے سے بلند ہوتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ میری پائنتی کی طرف میز پر ایک گراموفون اور ایک ایمپلی فائر پڑا تھا۔ یہاں سے دو تاریں باہر بانس سے بندھے ہوئے بھونپو کو جاتی تھیں اور سرہانے کی

طرف ایک تپائی تھی۔ اس پر ایک پھٹا ہوا رسالہ اور اُون کا دو تین گز لمبا اُلجھا ہوا تاگا پڑا تھا۔

تپائی پر سیاہی، جمے ہوئے دُودھ اور اکھڑے ہوئے پالش کے نشان تھے۔ دیوار پر تین سال پُرانا اصغر علی محمد علی کے سو برس کے راز والا کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ چارپائی کے نیچے اَن گنت پُرانے پُرانے بُوٹ، سلیپر، سینڈل اور پوٹھوہاری جُوتے پڑے تھے اور فرش پر گرد کے علاوہ سُرخ سُرخ بجری کے چھوٹے چھوٹے ذرّات جو جوتوں کے ساتھ اندر چلے آتے تھے غالیچے کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ یہ جگہ اچھا خاصا کمرہ ہی تو تھی۔ پھر یہاں بیٹھ کر ہر کوئی اِدھر اُدھر کی ہر چیز کا جائزہ اچھی طرح سے لے سکتا تھا۔

جب برات شامیانے میں داخل ہوئی تو ہر کوئی نظارہ کرنے دوڑ کر برآمدے میں آگیا۔ ہم سب نے اچھے اچھے کپڑے پہنے تھے اور گلے میں گیندے کے پھولوں کے ہار ڈال رکھے تھے۔ لیکھا برآمدے میں ننگے پاؤں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر مُسکرانے لگی۔ میں نے ہار گلے سے اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا اس پر وُہ ہنسنے لگی اور میں نے گھبرا کر اپنا ہار ساجی کے گلے میں ڈال دیا۔ شہ بالا کے جتنے بھی ہار ہوں کم ہے۔ میں لیکھا سے بہت پہلے کا واقف ہوں۔ جب وہ آٹھویں میں تھی۔ نویں میں ہوئی۔ دسویں پاس کر لی اور جب وُہ کالج میں داخل ہونے کے لیے روتی رہی۔ وُہ دلہنوں کی سہیلی تھی۔ میں کئی چھٹیوں میں خالہ کے ہاں آیا کرتا تھا۔ یہیں سے میں اُسے جاننے لگا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ رنگ سانولا۔ ناک بہت ستواں اور نیم باز لمبی لمبی پلکیں بند ہوتی چھوئی موئی کی طرح اتنی پیاری کہ چھو لینے کو جی چاہتا۔ لال قلعہ دہلی کے عجائب گھر میں عین اُسی کی شکل کی ایک عرب لڑکی کی تصویر ہے۔ پر دُور کیوں جائیے۔ آپ نے کوئی لیکھا نہیں دیکھی۔ لمبے قد کی خوبصورت آنکھوں والی جس کے سر پر ہمیشہ سفید نینا ڈن کا منقش دوپٹہ ہو۔ بس وہی تو ہے لیکھا۔ میری لیکھا! اسے میں نے جب بھی دیکھا ننگے پاؤں دیکھا جب وُہ چلتی تو یوں معلوم ہوتا کہ زمین اُس کے ننگے پاؤں چُوم رہی ہو اور جب وُہ زمین کے سینہ سے چمٹ جاتے تو ایسے لگتا کہ اب نہ اُٹھ سکیں گے۔ مگر وہ انھیں ایسے جھٹکے سے اُٹھاتی کہ اس کی کمر میں ایک لہر سی پیدا ہو جاتی اور وہ ناچتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس کی چال ایک رقص تھی، ایک نا تمام رقص جو ابھی شروع نہ ہوا ہو۔

مگر جسے ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ سانچے میں ڈھلے ہوئے پاؤں بیقرار مچھلیوں کی طرح ادھر ادھر تڑپتے رہتے اور ان پر ساٹن کی شلوار کے بھاری پائنچے بھنور کی طرح گھوما کرتے۔

میں جعفری میں بیٹھا ہؤا ممتاز کو خط لکھ رہا تھا۔ تھانیدار صاحب کی وردی کھونٹی پر لٹک رہی تھی اور ان کی بیٹی کا وسل اپنے اڈے سے نکل کر میرے سر پر معماروں کے ساہول کی طرح جھوم رہا تھا۔ پرلے کونے میں گرامون پڑا تھا۔ لاؤڈ سپیکر کا مستری کبھی اندر آتا اور کبھی باہر بھونپو کے پاس جاتا۔ پھر اندر آ کر پیچ کش سے پاس پڑے ہوئے آلے میں کچھ ترمیم شروع کر دیتا۔ بھونپو کی آواز ٹھیک نہ تھی۔ بیچارہ مستری صبح سے پنجرے کے شیر کی طرح ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ تھک کر اس نے پیچ کش پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور ساؤنڈ بکس اُٹھا کر پھر ریکارڈ کی شروع کی لکیروں پر رکھ دیا۔ کوٹ سے رومال نکال کر ماتھے پر پھیرا اور آرام کرسی میں لیٹ گیا۔ اچانک پھر اُچھلا اور باہر بھونپو کے پاس جا کھڑا ہؤا۔ اس طرح کے ڈیڑھ دو سو پھیرے مار چکا تھا۔ میل بھر کی مسافت طے کر لی ہو گی۔ میں نے دیکھا وہ بھونپو کے پیچ کھول یا کس رہا تھا۔ میں پھر خط لکھنے لگا۔ وسل اسی حالت میں جھُوم رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے اُسے دیکھا تو وُہ بجنا شروع کر دے گا۔

برآمدے کے آخری سرے پر بچے کھیل رہے تھے۔ دو قطاریں تھیں، زرق برق لباس تھے اور ننھے ننھے گیت۔ جب وُہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے رنگ برنگی پریاں جادُو بھرے گانے گاتی جھلملاتے ہوئے چراغ لیے پھرتی ہیں۔ لڑکیوں کے بالوں میں ربن بندھے تھے اور آنکھوں میں سُرمہ تھا۔ لڑکوں کی جیبوں میں کھانے پینے کی چیزیں ٹھُسی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں ننھی ننھی چھڑیاں تھیں۔ وہ "ہم ٹھنڈی موسم سے آئے ہیں" کھیل رہے تھے۔ جب ان کا ہنگامہ بہت بڑھ گیا تو بیٹھک کے دروازے سے لیکھا نکلی، ننگے پاؤں، اور مجھے جعفری میں بیٹھا ہؤا دیکھ کر کھِسکتی کھِسکتی جعفری سے آ لگی۔ میں نے خط لکھنا بند کر دیا۔ لمحہ بھر کے لیے اُسے دیکھ کر میں بچوں کا تماشا کرنے لگا۔ ساجی کی باری تھی۔ وُہ ایک قدم آگے بڑھا اور جھُوم جھُوم کر گانے لگا "ہم ٹھنڈی موسم سے آئے ہیں" اور پھر ساری قطار کا جائزہ لے کر

اُس نے لیکھا کی چھوٹی بہن کی کلائی پکڑ لی اور کہا "ہم اس کو لینے آئے ہیں" اور اپنی قطار کی طرف لے چلا۔ مخالفوں نے شور مچایا کہ "اس کو" نہیں نام لو۔ ساجی پریشان ہو کر ٹکر ٹکر دیکھنے لگا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ بڑی بھاری کامیابی ایک منٹ میں ذلیل ترین شکست بن گئی۔ وہ گھبرا سا گیا۔ میں نے میز پر پنسل بجا کر لیکھا کو اپنی طرف متوجہ کیا جو کھڑکی سے کمر لگائے انہیں دیکھنے میں حد درجہ مشغول تھی۔ وُہ مڑی اور مُسکرانے لگی۔

"اس کا نام کیا ہے" میں نے پوچھا۔ "رو پا" وہ پھر مسکرائی اور جھک کر اپنی پنڈلی پر پڑی ہوئی ساٹن کی شلوار کھجانے لگی۔

میں جعفری کی دیوار کے پاس آیا۔ سوراخ کے پاس منہ کر کے زور سے بولا "ساجی! ساجی! ہم روپا کو لینے آئے ہیں، ہم روپا کو . . . . "

اور پھر ایک دم میں نے اپنے مُنہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں کہہ رہا ہوں "ہم لیکھا کو لینے آئے ہیں"۔ مجھے اس طرح دیکھ کر وُہ ایک دفعہ پھر مسکرائی۔ بچے شور مچانے لگے "ہم نہیں کھیلتے، ہم نہیں کھیلتے"۔ اور ایک غدر مچ گیا۔ میں اور لیکھا ہنسنے لگے۔ مستری تیج کشن بے کر گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور "آئی۔ سی۔ آئی۔ سی" کہتا ہوا پھر امپلی فائر پر ٹوٹ پڑا۔ لیکھا نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور واپس چلی گئی، ننگے پاؤں۔ اور میں تکتے ہوئے وسل کو تکنے لگا۔

سامنے دیگیں پک رہی تھیں۔ کھانے پکانے کی چیزیں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی میں آگ کی چمک اور لہسن اور پیاز کی کچی پکی خوشبوئیں کچھ اس طرح سے مل گئی تھیں کہ ساری فضا پلاؤ کی ایک بڑی سی رکابی معلوم ہوتی تھی۔ چاولوں کو دم دے رکھا تھا۔ باورچی ٹین کی کرسی پر بیٹھا ہوا پستے کی ہوائیاں کاٹنے لگا۔ اس کے پاس ایک لڑکا کشمش صاف کر رہا تھا۔ دو اور لڑکے چینی کی رکابیاں گرم پانی میں کھنگال رہے تھے۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے کشمش کو دیکھتے اور حسرت سے اس لڑکے جو ہر دوسرے منٹ کے بعد دس پندرہ دانے منہ میں ڈال لیتا اور پھر انہیں اس پھرتی سے چباتا کہ دیکھنے والوں کو پتہ نہ چل سکے۔ اس نے اپنے سر کو دونوں گھٹنوں میں دبا رکھا تھا۔ باورچی نے پستے کی تھالی زمین پر رکھ دی اور ٹین کی کرسی کی پشت پر پل پڑا۔ وُہ ذرا سی دیر کے لیے کسمسائی

چرچرائی اور پھر خاموش ہو گئی۔ "اس دفعہ مسلم لیگ جیتے گی۔" اس نے پھندنا پکڑ کر ٹوپی اپنے سر سے کھینچی اور اسے انگلی پر گھمانے لگا۔ "کیا نام لیگ کا سب سے بڑا افسر آیا تھا۔ ہماری تو ساری کی ساری برادری کیا نام ادھر ہی ووٹ دے گی۔ اپنے باپ دادا تو سالے ساری عمر بکتے ہی رہے ہیں۔ پر ہم سے تو وہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے رتبہ کے آدمی کی وہ نہ مانیں اور روڑی لے کر بھگت جائیں اُدھر۔" ——— اور پھر وہ ٹوپی کو انگلی پر گھماتے گھماتے اونگھنے لگا۔ لڑکے نے دونوں ہاتھوں سے کشمش پر دھاوا بول دیا۔ باورچی نے ایک دم آنکھیں کھول لیں "کھائے جا! سالے تیرے باپ کی گانٹھ سے تھوڑی ہی جاتا ہے۔ پر مجھے یہ بتا زردے میں تیری ماں کا بھیجا ڈالوں گا؟" لڑکے نے شرمسار ہو کر سارا سر گھٹنوں میں گھسیٹ لیا اور رکابیاں صاف کرنے والے کھلکھلا کر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے۔

ظہیر بھیا جعفری میں آئے۔ مجھے اس طرح بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئے "ارے تم یہاں ہو۔ شادی میں یہ کیا روکھا چہرہ بنا رکھا ہے۔" انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "یہاں آئے ہو تو رومانس لڑاؤ۔ ایسے موقعے ہر روز نہیں ملا کرتے ——— کچھ ہے پریکٹس؟" مجھے اُن کی یہ بے وقت آمد بُری معلوم ہوئی۔ ہم "چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو" سوچ رہے تھے اور وہ "دھم سے" آ گئے "پریکٹس؟" میں نے دُہرایا "تھوڑی سی ہے۔ ایف، اے کے زمانے میں گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک دفعہ رومانس لڑایا تھا۔ شدت کا ملیریا ہوا اور پھر پائیوریا ہو گیا۔ پھر سے اس کی جرأت نہیں کی بلکہ تاب ہی نہیں۔"

وہ ہنسنے لگے اور سگرٹ طلب کیا۔ بڑے ادب سے دو سگرٹ چیر کر انہوں نے تمباکو اپنے پائپ میں رکھا۔ دیا سلائی دکھائی اور پھر یہ کہہ کر چلے گئے۔

"لیکھا! لیکھا!" وہ میری جعفری کے آگے سے پھسلی جا رہی تھی۔ میری آواز سن کر ٹھٹھکی اور جعفری کے قریب آ گئی۔ اس دفعہ اس کے پیروں پر دھول کی ہلکی سی تہہ تھی۔ اس نے بند ہوتی چھوٹی موٹی ایسے مجھ کو دیکھا۔

وہ جانے لگی تو میں بے چین ہو گیا "بس؟" میں بولا اور جیب سے سگرٹ نکال کر سلگایا۔ وہ ٹھہر گئی "یہ سلیٹی پنسلیں نہ چھٹ سکیں آپ سے۔ پتہ نہیں ان میں کیا مزا ہے۔" یہ کہہ کر وہ چل دی اور پھر نہ رُکی۔ نہ ہی میں نے روکا۔ مزے سے سگرٹ پیے گیا۔

ایک کھڑکی آدھی کھلی تھی۔ اس میں سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ دونوں دلہنیں گھٹڑیاں بنی پڑی تھیں۔ لیکھا زمین پر بیٹھی دو تین لڑکیوں سے مٹھار مٹھار کر باتیں کر رہی تھی "چل" ایک لڑکی نے جواب دیا۔ شاید لیکھا نے کچھ کہا تھا "دفان ہو مُردار" وہ لڑکی پھر چلائی۔ اس دفعہ بھی مجھے لیکھا کے الفاظ سنائی نہ دیے "اچھا ری! اب ہمیں دفان ہونے کو کہتی ہے" اب کے اس کی آواز صاف سنائی دی۔ "ارے بھئی ناراض ہو گئی ہو" اس لڑکی نے چمکار کر کہا "دفان کے معنے پتا ہے کیا ہیں؟ سنو! اس کا مطلب ہے۔ خدا کرے تمھارا بیاہ جلدی ہو اور تم اپنے خاوند کے ساتھ فوراً چلی جاؤ"

"واہ ری میری مشکو! اپنی اس نئی ڈکشنری کو کب شائع کرو گی؟" لیکھا نے پوچھا اور وہ ہنستی ہوئی اس کے گلے سے چمٹ گئی۔ میں بھی آج تک دفان کے معنی غلط ہی سمجھتا رہا تھا۔

اگلے دن بڑی چہل پہل تھی۔ لاؤڈ سپیکر کچھ ٹھیک ہو گیا تھا اور دن بھر گلا پھاڑتا رہا۔ سنجوگ کا گانا "اک دل والا اک دل والی دونوں یہ مل مل گاتے ہیں" اتنی دفعہ بجایا گیا کہ جب آخری دفعہ بجا تو پتا ہی نہ چل سکا کہ کون کیا گاتا ہے۔ برآمدے کے ساتھ ساتھ اور سُرخ بجری بچھا دی گئی۔ شامیانے کے چاروں طرف ہرے پیلے بلبوں والا "دیل کم" لٹکا دیا گیا۔ دیگوں کے پاس شاگرد پیشہ لوگوں کا اضافہ ہو گیا اور کرسیاں اور صوفے منگائے گئے۔ رات کو نکاح تھا۔ دو دل والے اور دو دل والیاں ملائی جا رہی تھیں۔ میں جعفری کے جھروکوں میں سے سب کچھ دیکھا کیا۔ ریشم میں لپٹی ہوئی ایک مانو بلی سی لڑکی سب کی نگاہوں کا مرکز ہوئی تھی۔

کندھے پر منی بیگ لٹک رہا تھا۔ کلائی پر ننھی سی گھڑی، ناک پر بغیر فریم کی چوکور شیشوں والی عینک، ناخن خون آلودہ اور سر کے بال کسی خوفزدہ نیولے کی دُم کی طرح اُٹھے ہوئے تھے۔ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آتی۔ وہاں سے باہر شامیانے اور برآمدے کی درمیانی جگہ ذرا ٹھیرتی اور واپس اندر چلی جاتی۔ پھر نکلتی اور اس انداز سے کہ پہلی بار باہر آ رہی ہے۔ ذرا رُک کر، لچک کر، اور منہ بنا کر۔

جب وہ گیارھویں دفعہ برآمدے میں آئی تو ظہیر بھیا جعفری کی اوٹ میں سے ارشاد گرم پانی کے حمام کی طرف سے اور مُنیر برآمدے کے پرلے کونے سے جہاں چق لٹک

رہی تھی اس کی طرف ایک دم بڑھے۔ جب ایک دوسرے کے سامنے آئے تو تینوں شرما گئے۔ ذرا کھانسے، پپوٹے جھپکائے اور آپس میں ہاتھ ملا کر ہنسنے لگے۔ وُہ ان کے پاس سے گذر کر باہر اپنی جگہ پر ٹہلنے لگی۔ ان میں سے کسی کو بھی اس کے گذرنے کا احساس نہ ہوا۔ سب نے یہی ظاہر کیا۔

دُلہنوں کے کمرے میں دو بنگالی لڑکیاں ایک دم اُٹھ کر ناچنے لگیں۔ کھڑکی میں سے ان کے گھنگھروؤں کی جھنکار اور ڈھیگور کے گانے "ایکلا چولو، ایکلا چولو" کی آواز جعفری سے باہر نکلی۔ اس آدھ کھُلی کھڑکی سے موسیقی پرانی چھت کی طرح ٹپک رہی تھی۔

رات چھائی اور شامیانے سے قرأت بلند ہوئی۔ دودھ سی چاندنی، اس پہ بے شمار بلب، پھولوں سے لدے، دونوں دولہا براتیوں کے درمیان گیندے کے ڈھیر دکھائی دیتے تھے۔ قاضی صاحب سورتوں پر سورتیں پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میں اب بھی

اپنی جعفری میں رہا۔ چاند اور بلبوں کی مِلی جُلی روشنی جعفری میں منعکس تھی۔ نہ بہت اندھیرا تھا نہ چندھیانے والا اُجالا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چاند پر سرمئی چادر ڈال کر اس روشنی سے دیواروں پر سفیدی کر دی ہو۔ میں بوٹوں اور کوٹ سمیت چارپائی پر پڑا تھا۔ رضائی عرضاً اوڑھ رکھی تھی۔ مُنہ اور پاؤں ننگے تھے۔ ابھی ایک سگرٹ پیا تھا اور ابھی ایک اور پینے کو جی چاہتا تھا کہ دروازے کے پاس ایک سایہ جھلملایا، دیکھا ہی تو تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وُہ آہستہ سے اندر داخل ہوئی۔ مجھے لیٹا دیکھ کر گھبرا گئی۔ پھر آگے بڑھی، چارپائی کے قریب آکر ذرا جُھکی اور پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

"دو بھائیوں کا نکاح ہو رہا ہے اور جناب یہاں بوٹ سوٹ پہنے سو رہے ہیں۔" ہولے سے کھانس کر اُس نے مُنہ ہی مُنہ میں یہ کہا اور پھر تپائی کی طرف دیکھنے لگی۔ لٹکتے ہوئے دوپٹے کو کندھے پر پھینک کر اُس نے سگرٹ کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی ایک سگرٹ نکالا اور دیا سلائی جلا کر سگرٹ سلگانے لگی۔ اس ننھی سی لَو میں اس کا چہرہ میں نے آنکھ کی جھری میں سے دیکھا جیسے الحمرا کے کسی بڑے دالان میں ایک کھتی ہوئی موم بتی کے آگے کوئی لیکھا الف لیلہ پڑھ رہی ہو۔ ایک چھوٹا سا کش کھینچ کر اُس نے کلّے پھلائے اور پھر فوراً سانس چھوڑ دیا۔ ذرا سی دیر مجھ کو دیکھا۔ پھر ایک اور کش لیا اور ذرا جُھک کر سارا دھواں میرے منہ میں دھکیل دیا۔ شاید ایک دفعہ پھر ایسے

ہی ہوتا مگر نکاح کے چھوہارے اوپر اچھل کر شامیانے کی چھت سے جا ٹکرائے۔ مبارک باد کی صدا بلند ہوئی۔ باجا زور سے بجا۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وُہ سٹ پٹائی جلتا ہوا سگرٹ تپائی پر پھینک کر برآمدے میں بھاگ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ اس دھندلی روشنی میں بجری کے غالیچے پر ننگے پاؤں کے تین نشان بے ترتیب بوسوں کی طرح پڑے تھے۔ میں نے تپائی پر سے سلگتا ہوا سگرٹ اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ کارک والی جگہ گیلی تھی۔ میں نے اسے ہونٹوں میں دبایا۔ کش نہیں کھینچا اور پھر سگرٹ بجھا لیا اور رومال میں لپیٹ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ پھر پاسنگ شو کے باقی ماندہ سگرٹ معہ ڈبیا مروڑ تروڑ کر جعفری کے موکھے میں سے دُور دُور تک پھیلی ہوئی دُودھیا چاندنی میں پھینک دیے۔

فہیم

باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ برساتی نالوں کا شور بڑھ گیا تھا اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا چنگھاڑنے لگی تھی۔ بادل شدت سے دھاڑا۔ بجلی کا ایک کوندا تیزی سے لپکا اور پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چیل کے ایک جھنڈ سے ایسے پٹاخے چھوٹے گویا مشین گن چل گئی ہو۔ پروین نے لحاف اپنے مُنہ پر کھینچ لیا۔ سلیم اور نعیم جو ایک ہی بستر میں لیٹے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے ایک دم خاموش ہو گئے اور تڑاپ تڑاپ کرتی دھاروں کے درمیان عجیب اَن ہونی سی چیخیں سننے لگے۔ پھر ایک زور کا دھماکا ہوا اور برستی بوندوں میں بہت سے درخت دھڑام سے گرے۔

”کیا ہوا، باجی؟“ فہیم ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں بجلی گری ہے۔“ پروین نے اپنے خوف کو دباتے ہوئے کہا۔

”بجلی؟ کہاں گری، باجی؟“ فہیم نے پھر پوچھا۔

”قریب ہی گری ہے —— مگر تم سو رہو، یار۔“ اس دفعہ باجی کے بجائے سلیم نے جواب دیا۔ وہ چپکا ہو کر لیٹ ہو گیا۔ مگر اس کے دل میں خوف ابھی کروٹیں لے رہا تھا۔ بجلی کیوں گرتی ہے؟ کہاں گرتی ہے؟ کیسے گرتی ہے؟ گھروں پر تو نہیں گرتی؟ بہت سے ایسے سوال تھے جن کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ شاید کوئی بتا دے اُس کے ننھے سے دل میں اُمید کی چھوٹی سی کرن راستہ بھولے ہوئے جگنو کی طرح ٹمٹمائی اور پھر ایسے ہی جلتی بُجھتی خاموش ہو گئی۔ نسرین زانوؤں کو پیٹ میں دیے گھوک سو رہی تھی اور اس کے اُلجھے ہوئے بدبودار بال ناک کے نتھنوں پر سانس کی آمد و رفت کے ساتھ ساتھ دھونکی کی طرح کھلتے چمٹتے اور پھر الگ ہو جاتے۔ فہیم نے اس کا گرم گرم سانس اپنی ٹھنڈی ناک پر محسوس کیا اور پرے ہٹ گیا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسرین کے بال جڑ سے اکھاڑ کر تکیہ کے نیچے دے دے مگر سوئے ہوئے پر حملہ کرنے کو اس کا دل نہ مانا۔

بارش ذرا تھمی تو ٹروں ٹروں کرتی ہوا کی تیزی میں اضافہ ہو گیا۔ پروین نے لحاف سرکا کر نانی اماں کی طرف دیکھا جو چوکی پر بیٹھی ہونٹوں کو جلدی جلدی جنبش دیے جا رہی تھیں۔ ان کی یخ بستہ اور مڑی ہوئی انگلیاں تسبیح کے دانوں سے کھیل رہی تھیں۔ ایک دانے پر دوسرا دانہ ایسے گرتا جیسے آنسو کے بعد آنسو۔ آتشدان میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر سفیدی کی ایک تہ چڑھ چکی تھی اور وہ بوڑھے مینڈکوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ بلب کے گرد چکر لگانے والا ایک بڑا سا پتنگا بار بار شیڈ سے ٹکراتا اور ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ کبھی ہوا اپنا رُخ بدلتی تو بارش کی نوجوان اور سڈول بوندیں باغ میں کھلنے والے دریچوں کے شیشوں پر چھن چھن شن شن جھنیاں بجانا شروع کر دیتیں۔

"ہٹاؤ یار اپنی ٹانگ" سلیم نے جھلا کر کہا "پھر میرے اوپر ڈال دی!"

"کہاں لے جاؤں اسے؟" نعیم نے تنک کر پوچھا "جگہ بھی تو ہو۔"

"جگہ تو کافی ہے ادھر" سلیم اُٹھ کر بیٹھ گیا اور چارپائی کے اس طرف ہاتھ پھیرنے لگا۔

"ادھر جگہ ہے تو تم ادھر آجاؤ" نعیم نے غصّے اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

"اچھا" سلیم مان گیا اور انھوں نے جگہ بدل لی۔ پروین کا لحاف اب کھسک کے کندھوں تک آ گیا اور اُس نے اپنے پپوٹوں کو تیزی سے جھپکنا شروع کر دیا تاکہ سارا خوف کڑوی کسیلی دوا کی طرح بہہ جائے۔ سلیم نعیم کی چارپائی اور اس کی پلنگڑی کے درمیان نانی اماں کی کھاٹ حائل تھی۔ جس کے سرہانے دوہرے کے سپرنگ دار پلنگ پر فہیم اور نسرین لیٹے ہوئے تھے۔ تسبیح کی گردش رُکی۔ دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھے اور چہرے پر پھر گئے۔ نانی اماں بستر پر بیٹھیں اور پھر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ طاق سے دیا سلائی اُٹھا کر انھوں نے دروازہ کھولا۔ ہوا کا سرد جھونکا اندر لپکا اور حجامت بنانے والے بلیڈ کی طرح سب کے کانوں پر پھر گیا۔

"اوئی اللہ —— نانی اماں بھی کمال کرتی ہیں" پروین نے پھر اپنا لحاف سر پر کھینچ لیا۔ فہیم نے یہ دیکھنے کے لیے کہ نانی اماں نے کیا کمال کیا ہے جھٹ اپنا لحاف اُٹھا دیا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ نانی اماں نہ کمال! سب کو رضائی میں مُنہ چھپانے

دیکھ کر اسے بہت حیرت ہوئی۔ سامنے باورچی خانہ میں نانی اماں دیا سلائی جلائے اِدھر اُدھر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ صحن میں برستی ہوئی بوندیوں میں سے دیا سلائی ڈبڈبائی آنکھ کی طرح جھلملاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ فہیم کو ایسے لگا جیسے کوئی نیک دل پری بوڑھی ملکہ کا بھیس بدل کر ان کے گھر اسفنج کیک رکھنے آئی ہو۔ جب وہ آکر دوبارہ اپنے بستر پر لیٹ گئیں تو سب نے سوائے نعیم کے اپنے چہرے رضائی سے نکال لیے۔

"یار نیری یہ ٹانگ پھر ادھر آگئی۔" سلیم نے اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کروں پھر؟" نعیم غصے سے بولا۔

"کرنا کرانا کیا ہے۔ اِسے اپنے پاس ہی رکھو۔"

"اپنے پاس ہی تو ہے۔"

"اپنے پاس تو نہیں۔"

"نہیں تو نہ سہی۔"

"نہ سہی کا کیا مطلب؟"

"مطلب کیا ہونا تھا۔ وہی جو ہوتا ہے۔"

"جنگی!" آغا صاحب دوسرے کمرے سے فوجی انداز میں دھاڑے۔ "کیا بات ہے؟"

"سلیم بھائی خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہیں۔" نعیم نے بسور کر کہا۔

"یہ جھوٹ کہتا ہے ابا جی۔" سلیم کی نسوانی آواز بڑی مشکل سے آغا صاحب تک پہنچی۔ "بار بار اپنی ٹانگ میرے اُوپر ڈال دیتا ہے۔"

"مگر ابا جی ——"

"شٹ اپ مگر ابا جی کا بچہ۔" کمرہ گونجا مگر ابا جی کا بچہ خاموش ہو گیا۔

"نہ بیٹا لڑا نہیں کرتے۔" نانی اماں نے کہا۔ "بھائی بھائی تو محبت پیار سے رہتے ہیں۔"

"سلیم بھائی ہمیشہ اسی طرح کرتے ہیں۔" نعیم نے رو کر کہا۔

"تم تو خواہ مخواہ رونے لگتے ہو یار جنگی۔ ذرا اپنی اس ٹانگ کو اپنے پیٹ پر تو لٹا کر دیکھو۔ مو گری سے مو گری۔"

اس تشبیہ پر نعیم ایک دم ہنس دیا اور غیر ارادی طور پر اس کی ٹانگ سلیم کے پیٹ پر جا ٹکی۔

"بھائی جان تم میرے ساتھ سو جاؤ" پروین نے سلیم کو مشورہ دیا۔

"نا تیرے ساتھ کیوں سو جائے" نانی اماں چمک کر بولیں "بھائی بھائی جھگڑا ہی کرتے ہیں —— تمھارا نانا اور اس کے بھائی عمر بھر ایک دوسرے سے جھگڑتے ہی تو رہے"

"کیوں، نانی اماں" پروین نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس ایسے ہی، بھائی جو ہوئے —— دراصل جھگڑا تو میری وجہ سے چلتا تھا۔ بابو بھائی، خدا اسے جنّت نصیب کرے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی روح کو ثواب پہنچے، ہمیشہ میری طرف داری کرتا۔ تمھارا نانا، خدا اسے کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے، فقیر تھا ——"

"فقیر؟" فہیم بھونچکا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"ہاں بیٹا —— مگر یہ فقیر نہیں جو گلیوں میں مارے مارے پھرا کرتے ہیں" نانی اماں نے فقیر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "مگر تم ابھی تک جاگ رہے ہو، فہیو بیٹا؟"

"ہوں" کہہ کر فہیم پھر لیٹ گیا اور رضائی کے درزے سے چپٹی ناک والا چہرہ نکال کر غور سے نانی اماں کی باتیں سننے لگا۔

"—— طبیعت کے بادشاہ تھے تمھارے نانا۔ دل میں کسی چیز کی ٹھان لی تو پھر اسے پورا کر کے ہی دم لیا۔ ہم لاکھ سر ماریں، منتیں خوشامدیں کریں، طعنے اُلہنے دیں مگر وہ وُہی کچھ کرتے جو انہیں پسند ہوتا۔ گڑھ شنکر میں نائب تحصیلدار تھے۔ اتنی بڑی حویلی دو بھینسیں ایک گھوڑی چار کتّے۔ کسی نے آ کر شگوفہ چھوڑ دیا کہ کانگڑہ میں ایک درویش آئے ہیں جو کتے ہیں پورا کر دکھاتے ہیں۔ کسی سے ملتے نہیں۔ کسی کو مُرید نہیں بناتے۔ وُہ تو ایسی باتوں کے دل سے خواہاں تھے۔ جھٹ استعفیٰ لکھ بھیجا۔ صاحب بہادر نے بہت روکا مگر نہ مانے۔ تار بھیج کر تمھارے نانا اکبر کو بلایا اور مجھے اس کے ساتھ گاؤں بھیج دیا۔ میں نے لاکھ منتیں کیں۔ ہاتھ جوڑے۔ اللہ رسول کا واسطہ دیا مگر اُن کا دل ہمارے تمھارے ایسا ہوتا تو مانتے۔ میں نے کہا "اس موئے بتلانے والے سے کوئی پوچھے" نجّے علی کی سنوار جب وہ کسی سے ملتا نہیں تو اس کی کرامتوں کا پتہ کیسے

چلا۔" مگر تمھارا نانا بھی ایک ہی ضدی تھا۔ کہنے لگا "کاملوں کی کراماتیں بھلا چھپ سکتی ہیں؟ تم تو پگلی ہو—— بجائے خوش ہونے کے خفا ہوتی ہو۔ وہاں جا کر آخرت کا توشہ مہیا کروں گا۔ درویش کی خدمت گذاری اس ملازمت سے بدرجہا اچھی ہے۔ سرکار کی نوکری کاجل کی کوٹھڑی ہے اور اس میں دھبہ لگنے کا ڈر لگا ہی رہنا ہے"—— میں اس خبر لانے والے، استعفےٰ منظور کرنے والے اور تمھارے نانا کو کوستی وہاں سے چل دی کہ پاک پروردگار ان سب پر میرا صبر پڑے——"

"ناناجی پر کیوں؟" فہیم نے پوچھا تو سب ہنس پڑے۔

"یار تم سور ہو" سلیم نے اسے مشورہ دیا "خواہ مخواہ میں نیند حرام کرتے ہو"

"پھر وہ کامل ہو کر آئے نانی اماں؟" پروین نے پوچھا۔

"خاک! کامل کہاں سے ہوتے جو کچھ پاس تھا۔ وہ کانا درویش لے گیا—— ان موئے کانوں کی ایک رگ سوا ہوتی ہے نا۔ کھا پی سب کچھ ہضم کر کے راتوں رات نو دو گیارہ ہو گیا۔ تمھارا نانا شامت کا مارا پیدل چلتا گھر پہنچا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بڑھی ہوئی مونچھیں، کھلیان ایسی ڈاڑھی۔ مسلسل فاقے کاٹنے سے سیپی سا منہ نکل آیا تھا۔ پھٹی ہوئی قمیص سے کھوے باہر جھانک رہے تھے"—— فہیم نے اپنی کندھوں سے پھٹی ہوئی قمیص کو ٹھوڑی سے دبا لیا——

"میاں جی، اللہ ان کی قبر نور سے بھری رہے، تمھارے نانا پر بہت برسے" فہیم نے گردن پھرا کر باہر برستی ہوئی بوندوں کو سنا اور پھر متوجہ ہو گیا "کہتے تھے تمھیں اپنی جائداد سے عاق کر دوں گا۔ جب تک زندہ ہوں اس گھر میں تو کیا اس گاؤں میں بھی قدم نہ رکھ پاؤ گے۔ یاد رکھو تم نے میری بہو اور معصوم بچی کو تنگ کیا ہے——"

"معصوم بچی کون، نانی اماں؟" پروین نے پوچھا۔

"اسے تمھاری بڑی خالہ بیٹی!" نانی ماں نے جواب دیا "وہ چھوٹی سی تو تھی۔ ابھی پاؤں چلنا سیکھا تھا کہ آنکھیں دکھنے آ گئیں اور جب وہ ذرا......

"کیا کتھا چھیڑ رکھی ہے، نانی جی؟" دوسرے کمرے سے آغا صاحب کی آواز رعد کی طرح کڑکی "بچوں کو سونے دیجیے۔ آدھی آدھی رات تک جگائے رکھتی ہیں

آپ اور پھر صبح ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نا! نا! آپ بھی کمال کرتے ہیں ۔ ماں کا دل میلا ہو جائے گا۔" آغا صاحب کی بیوی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ آپس میں جھگڑنے لگے ۔ فہیم نے اپنا چہرہ رضائی کے اندر کھینچ لیا۔ "اللہ کرے ——— اللہ کرے ابا جی" ——— اسے کوئی مناسب بددعا سوجھ نہ سکی کیونکہ آغا صاحب اسی شام بارش ہونے سے چند گھنٹے پہلے اس کے لیے کل کا ایک فوجی سپاہی لائے تھے جو کوک بھرنے سے اپنی سیاہ بندوق ادھر اُدھر گھماتا تھا۔

"پھر کیا ہوا، نانی اماں؟" نعیم نے آہستہ سے پوچھا۔

"نا بابا، تمہارا ابا ناراض ہوتا ہے ——— اب سو جاؤ۔" نانی اماں نے دُکھے دل سے کہا۔

"ابا جی تو ہمیشہ ایسے ہی کیا کرتے ہیں ——— ابا جی کے بچے۔" پروین نے نفرت سے کہا اور نانی اماں کا کندھا ہلا کر کہنے لگی "سنائیے! سنائیے! نانی اماں۔ ہمارے ہوئے، چپکے چپکے۔"

"یار نعیم، ذرا پرے رہ۔" سلیم نے درخواست کی "تجھ سے تو بھینس کے کٹڑے کی سی بُو آتی ہے۔"

"اور گلاب کا عطر تو میرے خیال میں تیرے پسینے کو شیشی میں بند کرنے سے بن جاتا ہے نا۔" نعیم بھنا کر بولا۔

"بے شک۔"

اور جب نعیم کو کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ اور نزدیک ہو گیا "لے میں تو ایسے ہی سوؤں گا۔ کر لے جو کچھ کرنا ہے۔"

"دیکھو، نانی اماں۔" سلیم منمنایا۔

"نا بیٹا، جھگڑو نہیں۔ تمہارا باپ تو کمرہ سر پہ اٹھائے گا۔"

فہیم نے یہ سنا تو لحاف کھسکا کر کمرے کی چھت دیکھنے لگا۔

"میرے اتنے بچے ہوئے۔" نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا "مگر تمہارے نانا نے کبھی ان کو پھول کی چھڑی تک نہ ماری۔ کہا کرتے تھے بچے تو فرشتے ہوتے ہیں، ان کو مارنا گناہ ہے۔ تمہاری کراچی والی خالہ دن بھر محلہ کی تیلنوں اور جولاہی

سہیلیوں سے کھیلتی رہتی اور جب شام کو گھر واپس آتی تو کپڑے میلے، چیکٹ اور جھونٹوں میں من من خاک۔ میں دسپناہ لے کر مارنے لگتی تو گود میں اٹھا کر باہر نکل جاتے۔ میں کہتی تم اسے خراب کر دو گے تو الٹا مسکرانے لگتے کہ فرشتے کبھی خراب نہیں ہوتے —— ان کے پاؤں میں چکّر تھا۔ تین مہینہ سے زیادہ گھر پہ نہیں ٹھیرے۔ باہر دیوان خانے میں بیٹھے بیٹھے دل میں جانے کیا آتا۔ منہ اٹھا کر چل دیتے۔ یہ نہیں پتہ کہاں جا رہے ہیں۔ کب آئیں گے کچھ پاس ہے کہ نہیں۔ بیوی بچوں کے لیے بھی کچھ چھوڑ کر جا رہے ہیں یا نہیں۔ میں نے بیسیوں مرتبہ کہا کہ لڑکیوں کے لیے کیا سوچ رکھا ہے۔ آخر پرایا دھن ہے۔ کچھ دے کر ہی جان چھوٹے گی۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔ مسکرا کر یہی کہتے۔ "تم جانو اور تمھارا اللہ۔ جب آنکھ بند کر لی، پیچھے کچھ ہی ہو۔ میں رونے لگتی تو مجھے دلاسا دے کر کہتے "خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ اللہ مالک ہے۔ جس نے چونچ دی وہ چوگا بھی دے گا"—— خدا بخشے میری ساس ذرا سخت طبیعت کی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج مجھے ہی کرنا پڑتا۔ باقی سب بہوؤں کے گھر والے تو ساتھ رہتے تھے۔ ذرا بھی تنگی ترشی ہوتی۔ ٹسوے بہاتیں۔ ان سے جا لگاتیں۔ مجھ بیچاری کا کون تھا جس پر پھول جھڑتی۔ عمر بھر نوکر بن کر ان کی خدمت کی۔ دن بھر مکئی کا آٹا گوندھتے گوندھتے میری کلائی ٹیڑھی ہو گئی۔" نانی اماں نے لحاف سے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو نعیم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پروین نے کہا "ہائے اللہ! واقعی نانی اماں کا ہاتھ ٹیڑھا ہے۔"

"دکھانا، دکھانا!" سلیم اور نعیم ایک دم بول اٹھے اور نانی اماں نے اپنا ہاتھ ادھر بڑھا دیا۔ جب وہ دیکھ چکے تو نعیم نے آہستہ سے کہا۔

"میں بھی دیکھوں نانی اماں" مگر نانی اماں نے اسے بستر میں چھپا لیا تھا۔

"او تو ابھی تک جاگ رہا ہے" نعیم نے پوچھا "سو جا، کیا کرے گا دیکھ کر"

"سو جا، میرے لال" نانی اماں نے چمکار کر کہا "مجھے ٹھنڈ لگتی ہے"

"یہ کیا گڑبڑ ہے —— ہیں؟" آغا صاحب کا بادل پھر گرجا "حرام زادو! ساری رات جاگتے ہو اور صبح مُردوں کی طرح اٹھنے کا نام نہیں لیتے" پھر ان کی اور ان کی بیوی تکرار شروع ہو گئی۔

"بیٹیا، یہ بتی گل کر دو۔" نانی اماں نے سلیم سے کہا اور خود منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھنے لگی۔ سلیم نے بستر پر کھڑے ہو کر بتی بجھائی تو باہر سے ٹھٹھرتا ہوا اندھیرا اندر سمٹ آیا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشے دُھندلے دُھندلے ہو گئے۔ گو ان میں سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ تاہم ایسے لگتا تھا کہ ابھی کچھ دکھائی دینے لگے گا۔ آتش دان میں پڑے ہوئے کوئلوں کی چمک بڑھ گئی اور بوندوں کی ٹپاٹپ میں اضافہ ہو گیا۔ سب نے یوں محسوس کیا جیسے بتی بجھانے سے سردی بڑھ گئی ہے اور ہر ایک نے اپنا لحاف اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ فہیم اور نسرین کا لحاف بہت پتلا تھا۔ اس وجہ سے ان پر ایک کمبل ڈالا ہوا تھا جو آہستہ آہستہ کھسکتا جا رہا تھا۔

"ایسی ہی سرد رات تھی" نانی اماں نے کہنا شروع کیا "جب تمہارا نانا گھر سے نکل کھڑا ہوا اور بہت دُور نکل گیا۔ اندھیاری رات، تیز بارش اور قدم قدم پر گہری کھڈیں۔ مگر وہ چلتا رہا اور چلتا رہا۔ اچانک اسے باؤلی لومڑی کے چلانے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ اس کس مپرسی کی حالت میں نہ پاس لاٹھی تھی نہ لکڑی۔ توکّل کے سر پر چلتا رہا۔ آنکھیں بند کیے، اللہ سے لَو لگائے کہ ایک دم باؤلی لومڑی نے پنڈلی پر کاٹ کھایا۔۔۔"

"پھر؟" فہیم نے تڑپ کر پوچھا۔

"یار سنو تو سہی۔" سلیم نے دوستانہ طور پر کہا۔ "خواہ مخواہ بیچ میں اپنی ٹانگ اڑا دیتے ہو۔"

"ہاں بیٹا، تُو چپکے رہ کر سُنتے جا۔ بڑوں کی باتوں کو ٹوکا نہیں کرتے۔" نانی اماں نے اُسے آداب سکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا پھر، نانی اماں؟" سلیم نے پوچھا۔

"پھر کیا ۔۔۔ تمہارے نانا فوج میں صوبے دار رہ چکے تھے۔ لپک کر اسے گردن سے پکڑ لیا۔ کلّوں میں اُنگلیاں ڈال کر جو زور لگایا تو گردن تک چیر کے رکھ دیا۔ پھر ایک جبڑے پر پاؤں رکھ کر تھوتھنی ہاتھ میں پکڑ کر جو ایک جھٹکا دیا تو لومڑی دو حصّوں میں چیر کر رکھ دی۔ اندھیرے میں اس کا کلیجہ نکال کر چبا گئے۔" "کیوں؟" نعیم نے پوچھا۔

"باؤلی لومڑی کاٹ کھائے تو اس کا علاج یہی ہے کہ اس کا کلیجہ کھا جاؤ۔"

"کچا ہی کھا لیا؟" فہیم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں یار، کچا ہی" سلیم نے زرشرد ہو کر جواب دیا۔ "میں پوچھتا ہوں تم سوتے کیوں نہیں" وہ پھر چپکا ہو گیا۔ تو سلیم نے نعیم سے ملتجیانہ لہجہ میں کہا "یار، اب تو اُٹھا لے اپنا زانو میری تو ٹانگ بھی جھنانے لگی ہے۔"

"لے بابا لے ـــ بس؟" نعیم نے پوچھا۔

"ہاں ـــ بس ـــ مہربانی۔"

"نانی اماں، لومڑیاں یہاں بھی ہوتی ہیں؟" پروین نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"نہیں بیٹی، یہاں نہیں ہوتیں۔ یہاں تو صرف بندر ہی ہوتے ہیں" نانی اماں نے تسلی آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

"بندر تو ہوتے ہیں پر ـــ اچھا ـــ" پروین نے خود ہی فقرہ بیچ میں چھوڑ دیا۔

"پر کیا باجی؟" فہیم نے ہولے سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" پروین نے جواب دیا۔

"یہ حضرت جی آج نہیں سوئیں گے" نعیم نے طنز کی۔ فہیم چپکا ہو رہا اور نسرین کو پرے دھکیل کر پہلو کے بل لیٹ گیا۔

"جب بھی تمھارے نانا باہر سے آتے کوئی تحفہ ضرور لاتے" نانی اماں کو اچانک پھر خیال آیا۔ "کبھی کسی فقیر کو ساتھ لے آتے۔ کبھی کوئی خوب صورت کتا اُٹھائے چلے آتے۔ کبھی کسی غریب عورت کو بال بچوں سمیت گھر پر بٹھایا کہ ان کی خدمت کرو میں کما کر لاؤں گا۔ پھر جب تک وہ عورت رہتی تو کرنی ضرور کرتے۔ اس کے بچوں کے لیے کپڑے بنواتے انھیں پڑھواتے اور جب کوئی اور وسیلہ اپنے سے بہتر ان کے لیے دیکھتے انھیں وہاں جانے کی تلقین کرتے۔ کشمیر سے ڈھائی تین سو روپیہ کما کر لائے اور راستہ میں ایک گائے خرید لی۔ من موہنی رنگ برنگی ننھے ننھے سینگوں والی . . . . . ."

"جیسی کراچی والی خالہ کے پاس ہے" فہیم نے خوش ہو کر پوچھا۔

"بھئی فہیم، بات تو سننے دو یہ کیا بدتمیزی ہے" پروین نے جل کر کہا۔

"ہاں ویسی ہی۔ بلکہ اس سے بھی خوبصورت ـــ آتے ہی زنانہ کر دیا اور

کھونٹے گڑوانے لگے۔ جب گائے بندھ چکی تو ہم سب دیکھنے آئے، سنہری جسم کی، اس پر سفید دھبے۔ تمہارا ماموں نذر اس وقت چھوٹا ہی تھا۔ خوش ہو کر بولا جب مرے گی ہیں اس کی کھال سے اتنی ساری جُوتیاں بنواؤں گا۔ ہنس کر کہنے لگے، دیکھ تو جی اپنے بیٹے کے ڈھنگ، ہماری گائے کی موت کی دُعا مانگ رہا ہے۔"

"نانی اماں" فہیم نے اٹک کر پوچھا" کتے کے چمڑے سے بوٹ نہیں بنتے؟"

اسے جون صاحب کا کتا یاد آ گیا۔ جو کل مرا تھا اور جسے انھوں نے "بلعنہ" کھال کھدیں پھینک دیا تھا۔

"یار جنگی! کل فیبو کا بوریا بستر یہاں سے اُٹھواؤ" سلیم نے تنک کر کہا فہیم سہم گیا اور اپنی دونوں ٹانگوں کو کھینچ کر پیٹ سے لگا لیا۔

"وہ اتنا عرصہ سرکاری نوکر بھی رہے۔ تجارت بھی کی۔ دوسری ملازمتیں بھی کیں۔ مگر سوائے فوج کے کبھی بوٹ نہ پہنے۔ میری خواہش تھی کہ وہ بھی دوسرے بھائیوں کی طرح کھٹ کھٹ کرتے چلیں۔ آخر کونسی کمی تھی ان میں مگر وہ نہیں مانے۔ یہی کہتے رہے، بُوٹ پہن کر آدمی مغرور ہو جاتا ہے۔ اس کی اونچائی اور آواز انسان کے دل میں تکبر پیدا کر دیتی ہے۔ میں اور سارے کام کرنے کو تیار ہوں پر بُوٹ نہیں پہنوں گا۔۔۔۔"

فہیم نے سپرنگ دار پلنگ پر سے لٹک کر اپنے بوٹوں کو نانی اماں کی چارپائی کے نیچے دُور دھکیل دیا۔

"اور اس گائے کا کیا بنا، نانی اماں؟" پروین نے پوچھا۔

"بنتا کیا تھا۔ کاغذ کی مورت سے گھر سجا کر رکھ دیا۔ میں بالٹی لے کر دوہنے لگی تو لات مار کر دُور ہٹ گئی۔ بھُوکی سمجھ کر چارہ ڈالا۔ وہ اس کے کھانے میں مشغول ہوئی اور میں نے موقعہ جان کر اسے دوہنا شروع کیا۔ لاکھ تھن دباتی، پانی لگاتی مگر وہ بند نلکے کی طرح سُوں کر کے وہیں رہ جاتے۔ شام کو آئے تو میں نے پوچھا خریدتے وقت دوہ کر نہیں دیکھی تھی۔ مُنہ ڈھیلا کر کے کہنے لگے۔ دُودھ کے لیے تھوڑی خریدی ہے۔ خوبصورتی کے لیے سودا کیا ہے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر چُپ ہو رہی۔ انھیں کون سمجھاتا —— جب وہ اگلے دورے پر گھر سے نکلے تو میں نے اسے بیس روپیہ میں بیچ دیا۔

"دو سُے صفر میں!" فہیم نے آہستہ سے کہا۔ مگر اب کے کوئی نہیں بولا۔ شاید کسی نے سُنا نہیں۔

" ادھر وہ گھر سے نکلتے ادھر بابو بھائی روپیہ کے بتیس لفافے لے آتے۔ جس کسی نے پتہ دیا ادھر ایک لفافہ لکھ دیا اور جب تک جواب نہ آتا ایسے ہی کرتے رہتے اور وہ بھی ایسے تھے، اب انھیں کس مُنہ سے کوسوں، کہ جواب تک نہ دیتے تھے۔ بابو بھائی جب بھی اُن سے آنے کی درخواست کرتے وہ یہی عُذر لکھ بھیجتے۔ کیسے آؤں! کیونکر آؤں! میں بابو بھائی سے ہمیشہ یہی کہتی لکھ دو "کیا پاؤں میں مہندی لگی ہے جو آنہیں سکتے یا بیچ بڑے راہ مارتے ہیں؟" اور جب بابو بھائی انھیں یہ لکھتے کہ بہو بھابی نے لکھوایا ہے تو آنے کی تیاری شروع کر دیتے گو آنہ سکتے۔۔"

"آ کیوں نہ سکتے، نانی اماں؟" فہیم نے پھر پوچھا۔

"بابا تمھیں کچھ تو ہے نہیں۔ خواہ مخواہ باتیں سُن رہے ہو۔" نعیم نے تنگ آکر کہا۔ "بھلا کس کی باتیں ہو رہی ہیں؟ کچھ خبر بھی ہے یا یونہی رت جگا منائے جاتے ہو؟" جب نانی اماں نے بھی یہی کہا "بیٹا! تم سو جاؤ۔ مفت میں نیند خراب کرتے ہو نہ کچھ تمھارے پلے پڑتا ہے۔ نہ ہمیں بات کرنے دیتے ہو۔" تو فہیم خاموش ہو گیا۔ اس کے ننھے سے دل کی جھیل میں ہر بات کنکر کی طرح گرتی۔ لہریں پیدا ہوتیں اور پھر بڑھتی جاتیں، اتنی دُور تک کہ اس کا دل ان حلقوں میں پھنس جاتا، اس بُری طرح سے کہ نکالے نکل نہ سکتا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پپ کتا سب سے عجیب تھا اور سچی بات بھی یہی ہے کہ وہ تھا بھی بہت سمجھ دار۔ ایک بار ہمارے پڑوس میں چوروں نے سیندھ لگائی اور دو صندوق اُٹھا کر لے گئے۔ پپ چھت کی منڈیر پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جب وہ جانے لگے تو ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ نلار کے جنگل میں جا کر انھوں نے دونوں صندوقوں کو دبا دیا۔ پپ سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب وہ چلے گئے تو سیدھا گھر پہنچا اور تمھارے نانا کی چادر پکڑ کر کھینچنے لگا۔ وہ نیند میں تھے۔ پپ کے زور کا تھپڑ مارا۔ ۔ ۔ ۔"

"تھپڑ کیوں مارا؟" فہیم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یار حد ہو گئی۔" سلیم نے کہا۔ "کس نے مارا بھلا تھپڑ۔ پپ کیا ہوتا ہے بھلا؟"

سلیم کو درشتی سے مخاطب دیکھ کر فہیم پھر چپ ہو گیا۔

"وہ چونک کر اتنی دُور جا کھڑا ہوا" نانی اماں نے پھر شروع کیا۔" اور کُو کنے لگا میں نے انھیں اُٹھایا کہ کوئی خاص بات ہے جو چلّا رہا ہے۔ وہ اُٹھ کر باہر گئے تو گوراندتہ سر پیٹ رہا تھا اور سیندھ لگی دیوار سے چاند کی روشنی اندر جا رہی تھی۔ پپ اب بھی ان کے ساتھ چونس! چونس! کرتا بار بار دروازے کی طرف جاتا تھا۔ جب اس کی بے چینی حد سے بڑھ گئی تو تمھارے نانا اس کے ساتھ چلے۔ ان کے ہمراہ گوراندتہ اور گاؤں کے دو تین دوسرے لٹھ بند جوان بھی۔ پپ تلار کے جنگل میں اُسی جگہ جا کر زمین کھودنے لگا۔ صندوق برآمد ہو گئے۔ گوراندتہ پھُولا نہ سمایا۔ سو روپے تمھارے نانا کو دیے کہ یہ پپ کے دُودھ کے لیے ہیں مگر انھوں نے نہ لیے......"

"لیے کیوں نہ؟" فہیم نے پھر پوچھا۔

"بس ایسے ہی" نانی اماں نے جواب دیا۔

"بس نہ لیے سو روپے" نعیم نے فہیم سے کہا۔

"سو روپیہ بھلا کتنا ہوتا ہے؟" پروین بھی چمکی اور فہیم ان کے فضول سوالوں سے تنگ آ کر چُپ سادھ گیا۔

"سلیم سو گیا؟" نانی اماں نے پُوچھا۔

"ہاں" نعیم نے جواب دیا اور اپنی ٹانگ اس کے پیٹ پر رکھ دی۔

بجلی زور سے چمکی اور سب سے اُونچی چوٹی پر چیل کے درخت روشن دان کے شیشوں میں منعکس ہوئے۔ جب بجلی چمکتی تو بہت دیر بعد بادل کے گرجنے کی آواز سُنائی دیتی۔ بجلی کی روشنی بالکل سفید نہ تھی نیلگوں سفید تھی۔ جس کے حاشیہ پر قرمزی رنگ جھلکتا اور دونوں سروں پر سُرمئی گرد سی اڑتی دکھائی دیتی۔ جب وہ چمک جاتی تو فضا میں دیر تک پیلی سی لہر با لکیر کانپتی رہتی جس کے چاروں طرف نیلے اور سرخ دھبے سے ناچنے لگتے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سبز ہو جاتی۔ گہری سبز زمرد کی طرح اور اس رنگ سے زہریلے اور کڑوے سوتے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے جو ساری فضا کو کسلمند بنا دیتے۔ ایسے لگتا جیسے ساری فضا تلخ ہو گئی ہے اور وہ سبز ٹیڑھی میڑھی لکیر کلڑ کے مُردہ سانپ کی طرح زہر اُگل رہی ہے۔ بجلی پھر چمکی اور پہلی سبز مُردہ لکیر میں جان پڑ گئی۔ اس کا رنگ پھر زرد ہو گیا۔ سُرخ اور نیلے دھبے ایک بار پھر اس

کے گرد گھومنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ دونوں منحنی خطوط زرد سے سبز ہو کر نیل ملے گلابی ہو گئے۔ ان کے کونے نسواری رنگ اختیار کر گئے اور درمیانی جگہ فاختئی رنگ کی ہو کر دُور دُور پھیلے ہُوئے اندھیرے کی جانب بڑھنے لگی۔ بجلی کی لاش اندھیارے کے چیونٹے گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر کوئلوں پر سفید تہیں بہت دبیز ہو چکی تھیں اور جھنجھری کے نیچے کافی راکھ گر چکی تھی۔ کوئلوں کی حدّت کمرے میں بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھی۔ اندر ہر چیز خاموش تھی مگر باہر بارش کا شور پھر بڑھ گیا۔

"ایک ایسی سرد رات پپ بھیگ کر مرا ہو گا" نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میں تو گاؤں میں تھی اور تمھارے نانا لورالائی میں پھر نائب تحصیلدار ہو کر آن لگے۔ پپ کو وُہ اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ کتے رکھنے کا شوق ضرور تھا مگر ان کی دیکھ بھال نہ کر سکتے تھے۔ سب کام نوکروں پر چھوڑ رکھا تھا۔ ایک ایسی ہی سرد رات غلطی سے باہر رہ گیا۔ شب بھر جھاڑ پڑتے رہے۔ بہتیرا چیخا چلّایا، دروازوں کو کاٹتا کھروچتا رہا مگر شور میں کسی کو آواز سنائی نہ دی۔ دوسرے سب دروازے بند تھے۔ صبح جب باورچی دُودھ لانے باہر نکلا تو پپ دروازے کی دہلیز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ باورچی نے پچکارا مگر وُہ خاموش رہا۔ اُس نے دُودھ کا برتن ایک طرف رکھ کر اُس کا سر جو اُٹھایا تو وُہ اکڑا ہوا تھا۔ کوئی دِلاسا یا پچکار یا پپ پپ کی رٹ اس کی آنکھیں نہ کھول سکی —— اچانک ہمیں تار ملا کہ نائب تحصیلدار صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ جلد پہنچو۔ ہم نے تھوڑا سا اسباب درست کیا۔ میاں جی کہنے لگے۔ اس کچر گھان کو کہاں اُٹھائے پھرو گی۔ یہیں چھوڑ جاؤ۔ سب سے چھوٹی بچی ساتھ لیے چلتے ہیں۔ وُہ تمھاری امّی تھی۔ ان کے نوکر ہونے سے پورا ایک مہینہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ جب ہم سوار ہوئے تو سب نے تسلّی دی اور یہی کہا کہ اَب انھیں ساتھ لینے آنا۔ میری بھی یہی مرضی تھی۔ راستہ بھر میری بوڑھی ساس خدا سے منّتیں مانگتی گئی۔ وُہ گاڑی میں ہر نئی سوار ہونے والی عورت کے پاس جاتی اور اپنے بیٹے کی صحت اور سلامتی کی دُعا کے لیے درخواست کرتی —— تمھاری امّی نے راستہ میں ہمیں بہت تنگ کیا۔ سرد ہوا لگی تو چھینک چھینک کر بے حال ہو گئی اور ہمیں بھی پریشان کر دیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ڈاکٹر دوائی دے کر نکلا تھا۔ میں

نے باورچی سے پوچھا کہ بخار کیسے آیا تو وُہ رونے لگا اور پپ کے مرنے کی داستان سُنائی۔ جس کا اثر تمھارے نانا کے دل پر بہت گہرا ہوا تھا۔" وہ جب کھانا کھانے بیٹھتے" باورچی نے بتلایا "تو پپ پاس آکر کھڑا ہو جاتا اور وُہ روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر اس کے آگے پھینکتے رہتے۔ جس دن پپ مَرا اور وُہ کھانا کھانے بیٹھے تو دیر تک انتظار کرتے رہے مگر وُہ دم ہلاتا اُن کے پاس نہ آیا۔ حالانکہ وُہ خود ہی اُسے دفن کر کے آئے تھے۔ یُوں ہی زہر مار کر کے جو اُٹھے تو زمین پر ٹکڑوں کا ڈھیر دیکھ کر بے اختیار رونے لگے۔ اس رات بھی بارش اُسی شدّت سے ہوئی چند گھنٹے ژالہ باری بھی ہوتی رہی تھی۔ موسم اس قدر خنک تھا کہ رضائی سے دم بھر کو مُنہ باہر نہ نکلتا تھا مگر تحصیلدار صاحب ساری رات صحن میں گھومتے رہے اور اُونچی آواز میں فارسی کے شعر پڑھتے رہے۔ میں نے باورچی خانہ کی کھڑکی میں سے دیکھا۔ ان کے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ داڑھی پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور سر کے بالوں سے چھوٹے چھوٹے چشمے جاری تھے۔ دوسرے دن آپ بیمار ہو گئے اور میں نے تار دے دیا۔ یہ کہہ کر باورچی پھر رونے لگا۔ میں وہاں سے آنسو پونچھ کر ان کے کمرے میں چلی آئی۔ میرے سسر ذرا باہر گئے تھے اور ساس چائے بنانے باورچی خانہ جا رہی تھی۔ جب میں ان کے کمرے میں پہنچی تو مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔" یہ بھی اچھا ہوا۔ تم لوگ یہاں آ پہنچے"۔۔۔ پھر تمھاری امّی کی طرف اشارہ کر کے بولے۔" یہ رشیدہ ہے؟ ۔۔۔ اسے میرے پاس لاؤ۔ مجھے اس کی شکل تو دکھاؤ"۔ اور جب میں اسے قریب لے گئی تو بولے۔ "لاؤ! لاؤ!! اسے میرے سینے پر لٹا دو"۔ مگر میں نے اس ڈر سے کہ مبادا کوئی متعدّی مرض میری بچی کو چمٹ جائے روتے روتے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس پر وہ ہنسنے لگے۔" اچھا تمھاری مرضی! تمھاری مرضی! میرا دل اسے چُومنے کو چاہتا تھا۔۔۔۔۔ خیر خیر"! وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرنے لگے تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ آدھی رات کو جب اُن کے کمرے میں میں تمھاری امّی کو دُودھ پلا رہی تھی تو میاں جی نے لرزتی اور دُکھی آواز میں انّاللہ و انّا الیہ راجعون پڑھا۔ میں چیخ مار کر اُٹھی اور تمھاری امّی بھی دُودھ کے اِس طرح ایک دم چھُٹ جانے سے چلّانے لگی۔۔۔۔ دوسرے دن جب ہم وہاں سے چلے تو صوبیدار کریم داد خاں نے، ہیں نعیم!

صوبے دار کریم داد خاں نے ـــــ نعیم! نعیم!!"

مگر نعیم اور سلیم کے خراٹے دو زنگ لگی آریوں کی طرح آپس میں رگڑ کھا رہے تھے۔

"پروین! پروین!!" نانی اماں نے اسے پکارا۔ "سبھی سو گئے! میں یونہی دیوانوں کی طرح بولتی چلی گئی۔" انھوں نے رضائی اپنے مُنہ پر کھینچ کر زور کی جماہی لی اور سدا رہے نام اللہ کا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

نسیم اُن کے سرہانے بیٹھا پھسک پھسک روئے جا رہا تھا۔

رات بیت رہی ہے

رات بیت رہی ہے ـــــ اور میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ خط لکھوں تو کیسے لکھوں۔ آج دن بھر دُھند چھائی رہی۔ ہم اپنے اپنے کیبنوں میں گھُسے اخبار اور تصویروں والے رسالے دیکھتے رہے۔ چائے آج معمول سے ایک بار زیادہ تقسیم ہوئی۔ بعض اوقات ایسی بے قاعدگی بڑی اچھی لگتی ہے۔ میں اپنے کمرہ سے خراماں خراماں دو دفعہ کنٹرول گیا۔ لیکن وہاں کچھ ایسی مصروفیت تھی کہ وہ لوگ ٹھیک سے میری باتوں کا جواب نہیں دے سکے۔ موسم خراب تھا اور لاسلکی پیام اچھی طرح سمجھ میں نہ آتے تھے۔ اتنا محسوس ہوتا تھا کہ ہمارے سارے لڑاکا طیارے سلامت ہیں۔ میں نے ایک دفعہ پیٹر کی آواز پہچاننے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ پھر میں اسی طرح راستہ کی ہر اُبھری ہوئی کیل اور بڑھی ہوئی لکڑی کو ٹھوکریں مارتا ہوا واپس آ گیا۔ جیب سے چیونگم گم کی ایک ٹکیہ نکلی! پتہ نہیں یہ کب سے وہاں پڑی تھی۔ کپڑے کی مسلسل رگڑ سے اس کی کھانڈ اُتر چکی تھی۔ میں نے اُسے مُنہ میں ڈالا تو تم یاد آ گئیں۔ اب اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ سمندر بالکل ساکن ہے۔ جہاز میں اب وہ ہچکولے نہیں۔ عرشہ گھر کا صحن لگتا ہے جہاں ہم سب اینٹیں کھڑی کر کے ہاکی سے کرکٹ کھیلا کرتے تھے اور تم نے مجھے خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ گیند اینٹوں کی سیدھ میں نہ پھینکا کروں۔ لیکن میری چھ پھینکوں کے بعد جیدی تمھیں پہلی بار ہی آؤٹ کر دیا کرتا تھا۔ یہ تو بتاؤ، میں نے کبھی ایسی جرأت کی؟ میرا جی چاہتا تھا تمھیں کبھی بھی آؤٹ نہ ہونے دوں اور تم نے کہا تھا کہ میرا جی بھی یہی چاہتا ہے کہ تم مجھے کھلاتے ہی رہو۔ لیکن اب خود ہی تم نے مجھے اتنی دُور بھیج دیا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی تمھارے جیسا ہے نہ تمھارے دیس کا! انگریزی کھانے کھا کھا کر میں تنگ آ گیا ہوں۔ اُردو میں بات کیے تقریباً ڈیڑھ مہینہ بیت چُکا ہے اور طرب انگیز لمحہ تو شاید ایک بھی نہیں آیا۔ پانی میں زندگی بسر کرتے

آج چھبیسواں دن ہے اور پتہ نہیں اور کتنے دن اسی طرح آسمان کے نیچے اور ساگر کی چھاتی پر گذر جائیں گے۔ کل رات پیٹر کیبن میں آیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔ وُہ مارگیرٹ کو خط لکھتا آیا تھا۔ فضائی حملہ کرنے سے پیشتر ہر امریکن ہواباز اپنی جانِ تمنا کو ایک لمبا چوڑا خط لکھا کرتا ہے۔ پیٹر کی شکل اب تک میری آنکھوں میں گھوم رہی ہے۔ وُہ میز کے ایک کونے پر بالکل غیر فوجی انداز میں چسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور مارگیرٹ کی باتیں کرنے لگا۔ اس سے متعلق ہر بات شروع کرنے سے پیشتر وُہ مُسکرا کر یہ ضرور کہتا "بھلا تم کسی دُوسرے کی داستانِ اُلفت میں کیا دلچسپی لو گے ——— لیکن تم اتنے اچھے ہو کہ اگر دُنیا میں مارگیرٹ نہ ہوتی تو میں صرف تمہاری دوستی کے سہارے زندگی بسر کر لیتا۔" پھر پرنسٹن یونیورسٹی کی ہلکی سی تمہید کے بعد وُہ تیرنے کے اس تالاب کا ذکر ضرور کرتا جہاں پہلے پہل ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے کئی ہزار مرتبہ یہ بتانے کے بعد بھی وُہ ہر دفعہ اس بات کا تذکرہ ضرور کرتا کہ اس دن مارگیرٹ نے سُرخ رنگ کی سکرٹ پہنی ہوئی تھی اور وہ لالے کا پھُول دکھائی دیتی تھی جو آسمان سے شبنم کے ساتھ اُترا ہو۔

پیٹر کا باپ کسی یونیورسٹی میں جغرافیے کا پروفیسر ہے۔ وہ رومن کیتھولک خیالات کا حامی ہے اور انجیل کو چُوم کر کھولتا ہے۔ اس کی جغرافیہ دانی نے پیٹر کو دیس دیس کی سیر کرنے پر مجبور کر دیا اور وُہ امریکن ہوائی فوج میں بھرتی ہو گیا ——— ہم پہلی مرتبہ یہاں ملے ہیں اور ہماری ملاقات کا آج چھبیسواں دن ہے امریکن بڑے جذباتی لوگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری دوستی سالوں کی منزلیں دنوں میں طے کر گئی ہے۔ جب میں واپس آؤں گا تو تمھیں پیٹر کی بہت سی تصویریں دکھاؤں گا جو اس نے مارگیرٹ کے ساتھ کھچوائی ہیں۔ ان میں ایک تصویر تو اتنی پیاری ہے کہ رہ رہ کر پیار آتا ہے، جہاں مارگیرٹ ایک سفید دریچے میں سے باہر کے درختوں کو دیکھ رہی ہے اور پیٹر اس کو دیکھ رہا ہے۔ پتہ نہیں یہ کھڑکی میں سے آتی ہوئی روشنی کا اثر ہے یا پیٹر کی آنکھوں کے شراروں کی چمک ہے کہ انتہائی سوچ کے باوجود مارگیرٹ کا چہرہ جگمگا رہا ہے۔ ایسے ہی خوشی سے ایک بار تمھارا چہرہ بھی دمک اُٹھا تھا۔ جب میں . . . . ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں تمھیں پیٹر کی بہت سی تصویریں دکھاؤں گا۔ اس نے اپنا البم مجھے دے

دیا ہے۔

اس وقت آدھی رات سے زیادہ بیت چکی ہے مگر اب بھی چھائی ہوئی ہے بلکہ اس کی تہہ پہلے سے دبیز ہو چکی ہے۔ سارے سمندر پر اندھیرا چھاؤنی ڈالے ہوئے ہے لیکن اب یہ ہولناک نہیں لگتا۔ گیلری میں کھُلنے والے چھوٹے سے روزن سے کچن کی روشنی آ رہی ہے۔ برتن کھنک رہے ہیں اور کنٹرول کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ پتہ نہیں یہ کب تک بجتی رہیں گی۔ میں تو ہر روز جلد ہی سو جاتا ہوں۔ ننھا بلب جس کی روشنی میز کے ایک مربع فٹ سطح پر مرکوز ہے وقت مقررہ پر خود ہی بجھ جاتا ہے۔ پھر صُبح چائے کی گھنٹی بیدار کر دیتی ہے۔ یاد ہے، ایک مرتبہ جیدی اور بلّو نے ایک ٹیلی فون بنایا تھا۔ سگرٹ کے دو ڈبوں کے درمیان ایک لمبی ڈوری باندھ کر ایک ڈبّے میں بولتا تھا اور دوسرا کان سے لگا کر سُنتا تھا۔ جب وُہ تمھاری امّی کو یہ انوکھی ایجاد دکھانے لائے تو میں ان کے پاس تخت پر بیٹھا پان پر چُونا لگا رہا تھا۔ امّی چھالیہ کتر رہی تھیں۔ تم بھی اسی کمرے میں تھیں۔ تمھاری امّی نے سر ہلا کر کہا "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ابّا کو دکھاؤ" جیدی نے ایک ڈبّہ مجھے دے دیا اور دوسرا تم نے خود بلّو سے لے لیا۔ ہمارے ہم کلام ہونے سے پیشتر ان دونوں سائنسدانوں نے ایک زبان ہو کر کہا "یہ کمرہ چھوٹا ہے۔ برآمدے میں چل کر سُنیے اور ڈوری کو کھینچ کر رکھیے نہیں تو بات نہیں سُنائی دے گی" پھر جب میں نے ڈبّے میں مُنہ ڈال کر کہا "رینا! تم مجھے . . . " تو تم نے ڈوری ڈھیلی کر دی اور میری بات مُنہ سے نکلی تو پوری پرواز سے پہلے ہی راستے میں پتنگ کی طرح کٹ گئی۔ پھر شاید تم نے میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اندازہ لگا کر بات ٹالنے کی کوشش کی تھی کہ بھئی جیدی ٹیلی فون تو اچھا ہے مگر اس میں گھنٹی نہیں بجتی۔ اس نے جواب دیا تھا کہ گھنٹی تو سوتے ہوئے کو جگانے کے لیے ہوتی ہے اور یہ ٹیلیفون جاگتے لوگوں کا ہے —— مجھے جیدی کی بات اب سمجھ میں آنے لگی ہے کہ گھنٹیاں کیونکر جگایا کرتی ہیں۔

ابھی چند منٹوں کی بات ہے میں سگریٹ سُلگا کر جلتی ہوئی دیاسلائی کا شعلہ دیکھ رہا تھا کہ ہارلو آ گیا اور میری کرسی کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ میرے طیارے کا توپچی ہے۔ پہلے نیویارک میں ایک فرم تھا۔ پھر ایئرمین بھرتی ہو گیا اور دو ہی سالوں

میں ایک اچھا نشانچی بن گیا۔ مخالف طیّارے اُس کی ماری ہوئی باڑھیں آج تک اکارت نہیں گئیں اور جو جہاز ایک مرتبہ اُس کے نشانہ میں آگیا پھر نہیں اُبھرا۔ ابھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ "میں جہاز کے پچھلے عرشہ سے ہو کر آیا ہوں جہاں ہمارا طیّارہ پڑا ہے۔ اُس کی آب و تاب ہی نرالی ہے اور وہ دُوسرے طیّاروں میں سب سے الگ دکھائی دیتا ہے میں اس کے پروں پر صلیب کا نشان بنا کر آیا ہوں۔ خداوند یسوع مسیح نے آج تک میرے طیّارے کو سبکسار نہیں کیا۔ اب بھی اُس سے یہی دُعا ہے"۔۔۔ پھر وُہ ذرا جھجک کر بولا "آپ نے کسی کو خط نہیں لکھا! میں تو تین لفافے لکھ کر ڈاک کے ڈبے میں چھوڑ آیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ ڈالی کو بھی خط لکھوں یا نہیں۔ وُہ میری سب سے پہلی آشنا ہے"۔

وُہ تو چلا گیا لیکن مجھے ایک گہری سوچ میں چھوڑ گیا۔ اچانک مجھے تم یاد آگئیں اور میں سوچنے لگا کہ کس کو خط لکھوں اور میں ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔

جن دنوں میں ایف۔ اے پاس کر کے اچھا خاصا آوارہ گرد ہو گیا تھا تو میری والدہ نے تمھاری امّی سے تمھاری موجودگی میں میری خودسری کی ساری داستان کہہ دی تھی اور تمھاری امّی صرف اتنا کہہ کر چُپ ہو گئی تھیں کہ آج کل کے سارے لڑکے باغی ہو گئے ہیں اور تم نے مجھے اسی دن ڈیوڑھی میں روک کر کہا تھا "بی۔ اے کا داخلہ ابھی بند نہیں ہوا۔ کسی کالج میں داخل کیوں نہیں ہو جاتے" تو میں نے کہا تھا "ہو جائیں گے۔ ایسی کونسی جلدی ہے۔ میرا دل پڑھنے کو نہیں چاہتا"۔

"لیکن میرا چاہتا ہے"۔

"تم تو پڑھ ہی رہی ہو"۔

"اپنے لیے نہیں تمھارے لیے کہہ رہی ہوں۔۔۔ کم از کم بی۔ اے تو کر لو"۔

"بی۔ اے" میں نے کہا "تم کہتی ہو تو سوچیں گے"۔

"لیکن اے، بی کورس لے کر کرنا ہوگا"۔

"اے، بی کورس یعنی حساب؟"

"ہاں"۔

"لیکن رینا یہ تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ آگے ایف۔ اے ہی بڑی مشکل سے پاس کیا ہے۔"

"اچھا تو اے کورس اور فلاسفی سہی۔"

"مگر.......؟"

"اگر مگر کچھ نہیں"، تم نے کہا "پہلے ہی تم کو بڑی رعایت دے دی ہے۔"

دُوسرے دن میں کالج میں داخل ہو گیا۔ پھر تم میری بڑی عزت کرنے لگیں اور مجھ سے ضِدّی بچّوں کی طرح چمکار چمکار کر کام لینے لگیں۔

ایک دفعہ جب میں تمھارے چھوٹے بھائی کے ساتھ تمھیں کالج سے لانے کے لیے چچا ابّا کی موٹر لے کر آیا تو تم نے کار میں بیٹھتے ہوئے اپنے بھائی سے کہا تھا۔ "ارشد تم مت چلانا۔" اس دن مجھے تمھاری نظروں میں اپنی برتری کا احساس ہُوا اور تم مجھے اچھی لگنے لگیں۔ بہت اچھی، سب سے اچھی!

ایسے ہی ایک دن جب میں ایک لفافہ جس کے فلیپ کی گوند تقریباً اُتر چکی تھی پانی لگا لگا کر بند کر رہا تھا تو تم ہنس پڑی تھیں اور لفافہ میرے ہاتھ سے جھپٹ کر کہا تھا "یہ ایسے بند نہیں ہوگا۔ جکڑنے والی چیز اُکھڑ چکی ہے۔ یہاں تو یہی پُرانا طریقہ استعمال کرنا پڑے گا۔" اور پھر لب لگا کر لفافہ بند کر کے آکسفورڈ ڈکشنری کے اندر رکھ دیا تھا۔ لیکن میں نے فوراً وہاں سے یہ کہہ کر کھینچ لیا تھا کہ "ٹھہرو مجھے بھی تو یہ طریقہ سیکھ لینے دو۔ خدا معلوم پھر کتنے ہی ایسے لفافوں سے پالا پڑے۔" لفافہ پھر کھُلا، زبان دوبارہ پھری اور پھر اسی طرح آکسفورڈ ڈکشنری کے نیچے دبا دیا گیا۔ لیکن پھر تم نے بھرپور نگاہوں سے مجھے نہیں دیکھا۔ ایسے ہی جگنو سے جھپکاتی رہیں اور اُٹھ کر چلی گئیں۔ بعض اوقات تمھاری رہبری بھی جھڑکیاں بھُول جاتی تھی۔

اکثر ایسے بھی ہوُا کہ تم نے اپنی پسند پر میری مرضی کو قربان کر دیا اور میں نے پتہ نہیں کیوں قربان ہونے دیا۔ میں بالوں میں ٹیڑھی مانگ نکالتا تھا۔ لیکن تم نے کہا "مجھے درمیان میں پسند ہے۔" میں نے کنگھی تمھارے آگے بڑھا دی تو تم نے کہا "میں خود نہیں نکالوں گی۔" پھر میری مانگ خود بخود سیدھی نکلنے لگی۔

پر اِن بالوں کو حسرت ہی رہی کہ کبھی تمھارے ہاتھوں سے منت پذیر شانہ ہوتے۔

ایک بار جب میں کرائے کی نئی سائیکل لے کر سارا دن اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا اور شام کو دُکان بند ہو گئی تھی اور میں سائیکل لے کر گھر آ گیا تھا تو رات کو کھلی ہوئی چاندنی دیکھ کر تمھارا جی چرایا۔ تم سائیکل برآمدے سے باہر گلی میں نکال لے گئیں۔ لیکن چلاتا کون! اس وقت اگر میں نہ ہوتا تو پتہ نہیں تم کتنی دیر ایسے ہی کھڑی رہتیں۔ پھر میں نے ہی تمھیں آگے بٹھا کر گلی کے اس سرے تک سیر کروائی۔ لیکن اُونچے نیچے گڑھوں والی زمین پر سائیکل اُچھلتی رہی اور میری ٹھوڑی تمھارے سر سے ٹکراتی رہی اور واپسی پر جب میں نے یہ رائے دی کہ دکانوں کی قطار کا چکر کاٹ کر اپنے گھر کے پچھواڑے جا اُتریں گے کیونکہ وہ راستہ ہموار تھا تو تم نے خود میری تجویز رد کر دی تھی۔ اگر اس طرح ایک بار پھر میری ٹھوڑی تمھاری مانگ کو چھوتی رہی تھی تو میرا قصور؟

جب تم کالج سے دوپہر کو گھر آتی تھیں تو میں اپنی کھڑکی کھولے ہوئے بیٹھا ہوتا۔ ہمارے گھر کے عین سامنے ایک چھوٹی سی کھائی تھی جسے تم ہمیشہ پھلانگ کر گذرا کرتی تھیں۔ تمھارے ساتھ اور دو تین لڑکیاں بھی ہوتیں مگر وہ کبھی اس طرح نہ گذری تھیں۔ یا تو اس سے کترا جاتیں یا ایک پاؤں اس میں اتار کر دوسرا اگلے کنارے پر رکھ دیتیں۔ میں یہی نظارہ کرنے کے لیے کھڑکی کے پٹ کھولے رکھتا تھا۔ تھوڑے عرصے بعد وہ کھائی پُر ہو گئی۔ لیکن تم نے اپنا انداز نہ بدلا۔ تم اس تازہ ڈھلی ہوئی مٹی پر سے اسی طرح گذرتی رہیں جیسے کھائی سے گذرتی تھیں اور وہ نشیب پُر ہونے کے باوجود میری کھڑکی بند نہ ہوئی۔ جب میں نے خدا کو ماننا چھوڑ دیا تو اوروں کے ساتھ تمھیں بھی رنج ہوا۔ بھائی جان سے میری لمبی لمبی بحثیں سُن کر تم نے مجھ سے پوچھا تھا "آخر آپ خدا کو مانتے کیوں نہیں ؟"

تو میں نے کہا تھا کہ "اس کے ماننے یا نہ ماننے سے انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔" تو تم نے جواب دیا تھا کہ "میں تو سمجھتی تھی فلسفہ سے تمھارا دماغ روشن ہو جائے گا۔ پر ــــــ"

"روشن ہی تو ہوا ہے۔" میں نے کہا تھا "جب وقت ــــــــــ"

"وقت اور فاصلہ میں کچھ نہیں سمجھتی" تم نے بات کاٹ کر کہا "آج سے خدا کو مانا کرو"

"لیکن ......"

"لیکن کچھ نہیں۔ میں جو کہتی ہوں کہ خدا ہے"

"پر ......"

"اچھا تو جا کر اپنی کھڑکی بند کر لو۔ سمجھ لو کہ آج سے وہ کھائی پُر چکی"

"میں تم سے تو شاید نہ ڈرتا۔ لیکن تمھاری دھمکی سے ڈر گیا" اور اس دن سے مجھے ہر شئے میں خدا کا ظہور نظر آنے لگا۔

کل رات پیٹر میرے پاس آیا تھا اور دیر تک بیٹھا رہا تھا۔ مگر آج نہیں آیا۔ میں نے کہا نا کہ وہ بڑا جذباتی ہے۔ البم دے گیا ہے جسے میں اب تک کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ اب بھی وہ میرے سامنے کھلا پڑا ہے۔ تین بجے شب طیاروں نے ٹیک آف کیا۔ ہم اس وقت مزے سے سو رہے تھے۔ صبح صبح میں کنٹرول گیا۔ لیکن وہاں حد درجہ کی مصروفیت تھی۔ چند منٹ تک پیٹر کے پیغام کا انتظار کرنے کے بعد میں اپنے کیبن میں واپس آ گیا۔ دوپہر کو ہمیں ونگ کمانڈر نے بلایا۔ دیر تک نقشہ پھیلائے ہم ادھر اُدھر نگاہیں دوڑاتے رہے پھر ایک خاکہ مرتب ہوا اور ہمیں پوزیشن سمجھا دی گئی۔ میں پھر آ کر پیٹر کا البم دیکھنے لگا جس کے اخیر میں مارگیرٹ کی ایک تصویر ہے۔ جہاں وہ پیٹر کی پی کیپ پہنے ہوئے ہنس رہی ہے۔ آٹھ طیارے واپس آ گئے مگر پیٹر نہیں آیا۔ کنٹرول نے پیام دیا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ہم سب عرشۂ جہاز پر نکل آئے اور آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائے انتظار کرنے لگے۔ تشویش بڑھتی گئی۔ ونگ کمانڈر مایوس ہو گیا۔ لیکن ہم لوٹ کر اپنے کیبنوں میں نہیں گئے۔ سمندر متلاطم ہو گیا تھا۔ دُور تک نیلا نیلا پانی بالکل سیاہ ہو گیا اور جہاز ڈولنے لگا۔ بڑی بڑی لہریں اُٹھتیں اور جہاز سے سر مارنے لگتیں۔ بہت سی اونچی اونچی لہریں عرشۂ جہاز پر آ کر پھیلنے لگیں۔ ہمارے بوٹ پانی میں ڈوب ڈوب جاتے اور پتلونوں کے پائنچے ٹخنوں سے لپٹ جاتے۔ لیکن سب کی نگاہیں نیلے آسمان میں گڑی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک سیاہ بادل اُمڈا اور تیزی سے ہماری طرف پھیلنے لگا۔ ہمارا

طیارہ آرہا تھا۔ اپنے پیچھے دھوئیں کا ایک دبیز بگولا چھوڑے اس کا ایک پر جل رہا تھا اور اس میں سے لمبے لمبے شعلے نکل رہے تھے۔ سب ایک طرف ہو گئے اور طیارہ گویا عرشۂ جہاز پر آکر گر پڑا۔ ہم نے ربڑ کے نلوں سے اس پر پانی کی بوچھاڑ کر دی اور پھر اس ادھ جلی چتا پر پل پڑے۔ میں نے کاک پٹ کھول کر جب پیٹر کو باہر نکالا تو اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ سٹریچر منگوایا اور اسے لے گئے۔ توپچی کا پتہ نہ تھا۔ پیٹر نے اپنے ناتواں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے کر کہا "ذرا میرا البم تو لاؤ"۔ ہارو میرے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اُسے کہا اور جب وُہ لے آیا تو پیٹر نے کہا "آخری تصویر نکالو"۔ میں نے مارگیرٹ کی وہی تصویر نکالی۔ پیٹر نے اسے اپنی دُھندلی نگاہوں سے دیکھا اور بولا "اسے میرے قریب تو کرو"۔ اور جب میں نے اُسے قریب کیا تو بولا "ذرا اور نزدیک"۔ اس کے بعد اس نے کہا "مارگیرٹ نے مجھے کہا تھا کہ مرد فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھو میری ٹوپی پہن کر یہ کس قدر خوش نظر آتی ہے۔ اسے ہوائی فوج سے بہت اُنس تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ میں ایک اچھا پائلٹ بن سکوں۔ میں پائلٹ تو بن گیا مگر شاید اچھا نہیں! یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر میرے ساتھ پرنسٹن کی گلیوں میں چلا کرو گے تو بری اور بحری فوجی ہمیں سلام کیا کریں گا۔ کاش اس کی یہ آرزو پوری ہو سکتی"۔

شام کو ہم نے پیٹر کو اس کے جلے ہوئے جہاز میں ڈال دیا اور ٹوپیاں اُتار کر اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ امریکنوں نے نہایت دردناک مگر اُونچے سُروں میں وُہی مشہور گیت گانا شروع کر دیا "آج تمام روئے زمین امریکہ کے پَروں کے نیچے ہے"۔

پھر اس کے جہاز کو آہستہ آہستہ دھکیل کر ہم نے سمندر میں پھینک دیا۔ ایک بڑا سا بھنور پیدا ہوا اور پھر طیارے کی جلی ہوئی دُم اس میں غرق ہو گئی۔ ونگ کمانڈر نے کہا "ایک اچھے ہوا باز کو کتنا اچھا تابوت ملا!" —— آج صبح میرا ٹیک آف ہے۔ اور ہم اسی عرشہ سے اڑیں گے جہاں سے کل رات ایک اچھا ہوا باز اُڑا تھا لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہارو بہت اچھا توپچی ہے۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا!

میں تمھیں پریشان کرنا نہیں چاہتا —— میں تو ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں کرسکا کہ خط لکھوں بھی تو کیسے لکھوں!

تلاش

ویسے تو یہ دانا پانی کے اختیار کی بات ہے لیکن اگر خان کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو جگی ہندوستان ہی رہ جاتا۔ اس بھگدڑ میں لوگ مال و اسباب تو کیا خویش واقارب تک کو بھول گئے۔ بھلا ٹھائیں ٹھائیں دغتی بندوقوں میں بیچارے احسان کی طوطی ایسی آواز کہاں پہنچتی جو کسی فوجی کی توجّہ سے اُلجھ کر احسان کی بہتی ہوئی آنکھیں اور ناک دکھا سکتی۔

جب خان نے کیپٹن حق نواز سے ہاتھ باندھ کر کہا کہ یہ اس چھوٹے سے بچّے کے لیے جان دے دے گا مگر اسے اپنے ساتھ ضرور لے جائے گا تو کیپٹن صاحب نے اسے جھٹلانے کے لیے طنزیہ مسکرا کر کہا" ابھی ٹیسٹ کیے لیتے ہیں"۔ پھر انھوں نے ٹرک کا انجن چلا کر پورے زور سے ایکسلریٹر دبا دیا۔ ایک ہلڑ مچا اور کندھوں پر چڑھے ہوئے والدین اور اولادیں ٹپکے کے آموں کی طرح زمین پر آ رہیں اور انھیں اُٹھانے والے ٹرک کی طرف ایسے لپکے گویا کسی نے آدمیوں کی باڑھ ماری ہو۔ احسان کا چہرہ ایک دم ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور وُہ بھی اس طرف بھاگا۔ لیکن اس نے جگی کو بغل سے گرایا نہیں۔ کیپٹن پیار سے ہنسا۔ انجن بند ہو گیا اور سب پھر اپنے اپنے آم چُننے لگے۔ احسان کے گال اُوپر کو ہلے اور ان بھیگے ہوئے پھُولوں سے جیسے دو شہابی تتلیاں آ کر چپک گئیں۔ کیپٹن نے ٹرک سے اُتر کر اسے جگی سمیت گود میں اُٹھا لیا۔ فوجیوں کے ذہن پر جب رحم و کرم کے بادل چھاتے ہیں تو نوازش ہائے بے جا کی بارش چھاجوں برسنے لگتی ہے!

اپنے بیٹے کی یہ عزّت دیکھ کر اُس کے ابّا آگے بڑھے اور بولے" یہ آپ نے کیا کیا کہ اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ ہمیشہ ڈرتی رہتا ہے۔ کتّوں سے کھیلتا ہے اور ـــــ اور" پھر احسان سے مخاطب ہو کر بولے" اترو بیٹا۔ انکل کی وردی

خراب ہو جائے گی۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔" کیپٹن نے کہا۔ "یہ ہمارا دوست ہے ــــ دوست ہونا؟"

احسان نے کوئی جواب نہ دیا تو اُس کے ابّا نے کہا۔ "اگر مستورات ابھی سے ٹرک میں بیٹھ جائیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"ضرور ضرور۔" کیپٹن نے احسان کو ٹرک میں اتارتے ہوئے کہا اور پاس کھڑے ہوئے سپاہیوں کو اُن کا سامان لانے کے لیے بھیج دیا۔

جب کافواٹے تیار ہو گیا تو کیپٹن بجائے آگے بیٹھنے کے پیچھے چلا آیا اور احسان کو ٹرنک سے اُٹھا کر اُس کے ابّا جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

دُور دُور تک آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی اور اس کے پیچھے مرنے مارنے والوں کا شور و غل ایسے لگتا تھا جیسے آسمانوں پر کا جہنّم مکمل ہو چکا ہو اور اب زمین پر اس کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا ہو۔ احسان پِلّے کو چھاتی سے لگائے کھڑا تھا۔ اس کی بہنیں کانپ رہی تھیں اور اس کے ابّا ٹوپی گود میں دھرے وُہ تمام سُورتیں دُہرانے کی کوشش کر رہے تھے جو انھیں بچپن میں یاد کرائی گئی تھیں۔

گُڈی بغیر آواز کے روئے جا رہی تھی اور نُجیمہ اپنے بُوٹ ہاتھوں میں پکڑے امّی کی گود میں چھپی ہوئی تھی۔ خان ابّا جی کے پاؤں میں بیٹھا ایک دیہاتی سے کلمہ پڑھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

جب ٹرک چلا اور احسان نے بیٹھنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا تو کیپٹن نے کہا۔ "آپ بیٹھ نہیں سکتے۔ آپ کو پِلّا لے جانے کا جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔" احسان کو یہ جُرمانہ بہت پسند آیا۔ اُس نے خوش ہو کر خان کی طرف دیکھا اور پھر جبکی کے نتھنوں میں پھُونکیں مارنے لگا۔

"اس میں کیا وصف ہے؟" کیپٹن نے پِلّے کو چھُو کر پوچھا۔

"جی یہ جبکی ہے۔"

"جبکی تو ہے پر اس کی صفت کیا ہے؟"

"جی یہ بھونکتا ہے۔"

"سبھی کتّے بھونکتے ہیں ــــ میں پوچھتا ہوں تم نے اس کے بجائے کوئی اور

کتا کیوں نہ پال لیا؟"

"یہ دیکھیے۔" احسان نے آگے بڑھ کر کہا۔" اس کے بیس ناخن ہیں۔ دُوسرے کتوں کے صرف اٹھارہ ہوتے ہیں۔ پانچ پانچ آگے اور چار پیچھے۔ وُہ اتنے طاقتور نہیں ہوتے۔ جیکی بہت طاقتور ہے۔ اس کا سر دیکھیے۔ نوردین کہتا تھا جب یہ بڑا ہو جائے گا تو ریچھ کا شکار کرے گا۔ بیس ناخنوں والے کتے اپنے پنجے ریچھ کی آنکھوں میں گاڑ کر اس کی تھوتھنی چبا جاتے ہیں۔"

باجی ہنسی تو اس کی امّی نے کہا۔" مجھے اس کی یہی باتیں زہر لگتی ہیں۔ صدقے کروں اس جیکی کو، یہ کم بخت تو اس کے لیے سڑی ہو گیا ہے۔"

جب اڑمڑ ٹانڈہ قریب آگیا تو احسان ذرا جھکا۔ لیکن اس نے جیکی کو یونہی چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے کیپٹن صاحب کی طرف بڑھا کر بولا۔" ذرا اسے پکڑ لیجئے۔"

"کیوں؟"

" مجھے پاؤں کھجانا ہے۔ بڑے زور کی کھجلی ہو رہی ہے۔"

کیپٹن صاحب نے پی کیپ اپنی گود سے اُٹھا کر احسان کے سر پر ڈال دی اور جیکی کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ جب وُہ پاؤں کھجا کر اُٹھا تو شبنم نُھنے سے کپتان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے بوٹ پھینک کر بولی۔" سانول بھائی، تم نے یہ ٹوپ کہاں سے لیا؟" مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ یہ وضعداری کے منافی تھا۔ پھر حق نواز نے جیکی لوٹا کر اس کے مالک کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

راستہ میں احسان نے اُسے بتایا کہ اس کے ابّا جان دلّی میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور ان دنوں وُہ باجی اور آپی کی شادی کرنے میانی آئے ہوئے تھے جو فسادات کی وجہ سے رُک گئی۔ ان دونوں کے منگیتروں میں سے وُہ آپی کے منگیتر کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ انھوں نے جیکی کو گود میں اٹھا لیا تھا اور ویسے بھی وہ ہر کتے سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ نسیم بھائی یُوں تو اس کے ماموں زاد بھائی تھے پر اسے اپنے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز تھے کیونکہ وُہ جب دفتر سے لوٹتے جیکی کو تالی پیٹ کر اور سیٹی بجا کر پاس بلاتے

اکثر اوقات وہ پوری پوری ٹانی جیکی کے آگے ڈال دیا کرتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک دفعہ انھوں نے اپنی عینک جیکی کو منہ میں دبائے دیکھ کر صرف رُومال کا ایک گولا مارا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی سزا تھی۔ احسان کا دل چاہا کہ کاش نسیم بھائی اس دن ٹرک میں ہوتے تاکہ وہ انھیں کیپٹن صاحب سے ملا سکتا اور جب امی جان کا ذکر آیا تو احسان نے گفتگو ذرا آہستہ کر دی کیونکہ ان کا رویّہ جیکی کے متعلق کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔

امی کی طبیعت میں ایک عجیب قسم کا تلوّن تھا۔ کبھی تو جیکی کو وہ خود ڈانٹ ڈالتیں اور کبھی مارے ٹھوکروں کے بے حال کر دیتیں۔ ہر وہ گالی جو اس کو دی جاتی احسان کے دل میں تیر کی طرح اُترتی اور ریتے ہوئے لوہے کی طرح پھول کر جیسے پانی میں ڈوب جاتی۔ اس وقت اس کا بس چلتا تو ایک چھوٹا سا گھر لے کر الگ ہو جاتا جس میں وہ اور اس کا محبوب کتا مزے کی زندگی گزارتے۔ باجی اور آپی جیکی کو اتنا اچھا نہ جانتی تھیں۔ وہ ہمیشہ اس کی برائی میں امی کا ساتھ دیتیں لیکن اس کے اوصاف گنوانے میں انھوں نے کبھی زبان نہ کھولی تھی۔ منی آپا جیکی کو اس قدر بُرا نہ سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جیسے اور چیزیں گھر میں یونہی پڑی رہتی ہیں ایک یہ بھی سہی۔ ناک میں اُنگلی پھیرتے ہوئے کبھی کبھار وہ جیکی کے پاس سے گذرتیں تو اپنے ننگے پاؤں سے اس کی پوستین سہلانے لگتیں اور وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر اپنی چاروں ٹانگیں اُوپر اٹھا لیتا۔ دراصل انھیں جیکی سے پیار نہیں تھا احسان سے تھا۔ وہ اُسے خوش کرنے کے لیے ایسا کرتیں اور اگر وہ موجود نہ بھی ہوتا تو بھی انھیں اس کے کتے سے محبت جتانے میں بڑا مزا آتا۔

کراچی پہنچ کر خان اکثر احسان سے پاسنگ شو کی سگریٹیں منگوایا کرتا اور اگر کبھی احسان موڈ میں نہ ہوتا تو وہ پیسے نکالنے سے پہلے تمہید باندھنی شروع کر دیتا۔ "دیکھو یار اگر ہم نہ ہوتے تو تیرا جیکی ہندوستان ہی رہ جاتا۔ رہ جاتا کہ نہیں؟ اور پھر دیکھ کہاں میانی اور کہاں کراچی؟ وہاں تو ایسے ایسے آدمی رہ گئے جنھیں یاد کر کر کے آج کئی گھر راتیں رو رو کے گذارتے ہیں ——— میں مر تو جاتا پر تیرے جیکی کو ادھر نہیں چھوڑتا تھا۔" خان کو اس سے نہ نفرت تھی اور نہ ہی لگاؤ۔ وہ تو صرف اپنے فن سے محبت کرتا تھا۔ باتیں بنانے کا اُسے ایک خاص سلیقہ تھا۔ ایسا سلیقہ

جس سے بڑے بڑے سنگ دل منٹوں میں پسیج جائیں۔ جیکی کو سوار کرانے کے لیے اُس نے جو کچھ کیا صرف اپنی تسکین اور فن کے مظاہرے کے لیے۔ عملی قدم احسان نے اُٹھایا۔

جس دن لمبے لمبے کُرتے والی دو سندھنیں کوارٹر کے سامنے سے گذرتے ہوئے برآمدے میں آکر ٹینم کا فراک کھسکا کر لے جانے لگیں تو جیکی جاگ اُٹھا۔ اپنی لچکیلی ہڈیوں میں ننھے ننھے پھیپھڑوں کو پُورے زور سے پُھلا کر اُس نے دو دفعہ بخ بخ کی اور پھر دُم ٹانگوں میں دبا کر لرزنے لگا۔ امّی آواز سُن کر باہر نکلیں۔ اس دوران میں وُہ فراک وہیں چھوڑ کر بھاگ چکی تھیں۔ امّی نے جیکی کا یہ کارنامہ سب کو سُنایا۔ احسان کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ وُہ جیکی کو گود میں اُٹھا کر ایک بار تو بس چُوم لے۔

امّی نے کہا "کتّا تو چہرے مہرے سے جھٹ پہچانا جاتا ہے۔ یہ نسل ریوڑوں کی رکھوالی کرتی ہے۔ کیا مجال جو موئے دم بھر کو سو جائیں۔ ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ جبھی تو کہتے ہیں کہ گڈریا اپنی بیٹی کا ڈولا دے دیتا ہے پر کتّا نہیں دیتا۔ یہ کم بخت تو ہے ہی ہڈیوں کا مُٹھا۔ ذرا ٹھیک سے خوراک ملے تو دنوں میں شیر کا جبڑا ہو جائے۔ پر ہمارے یہاں پابندی کہاں۔ میاں صاحبزادے سارا دن خاک اڑاتے ہشت ہڈو کرتے پھرتے ہیں۔ مجال ہے جو اس کے تسلے میں جھانک کے بھی دیکھیں۔ پچھلے دنوں اچھا خاصا بیمار رہا۔ میں جنم جلی اس جوگی کہاں کہ اس کی خبر بھی رکھوں۔ خود ہی لوٹ پوٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔"

احسان نے کہا "امّی میں تو . . . ."

"بس اب رہنے دے" امّی تنک کر بولیں "میں تم سب کے لچھنوں سے واقف ہوں۔ یہاں سب ہی بادن گز کے ہیں۔ میں کس کس کو پیٹوں؟"

احسان خاموش ہو گیا۔ واقعی وُہ اس کی خوراک کے متعلق محتاط نہ تھا۔ اس نے سوچا۔ چلو آج اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ منی آپا کی بائیں آنکھ پر جو گومڑی چند دن ہوئے نمودار ہوئی تھی اب سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی اور امّی انھیں ڈاکٹر کے یہاں لے کر گئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں جیکی کو مکھن لگے توس کھلانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ پر ڈاکٹر بھی نپہ نہیں کتنا بے حس آدمی نکلا کہ بغیر

نشتر زنی کے، مرہم لگا کر لوٹا دیا۔ احسان ابھی تک گلی میں کھڑا اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا کہ امّی جان واپس آگئیں اور جیکی کی ضیافت منسوخ ہو گئی۔

مگر جس دن بڑی ماں کا چالیسواں تھا۔ اس دن سب کی شامت آئی۔ امّی نہ رہی تھیں اور باقی سب بڑے کمرے میں مزے سے لیٹے تھے۔ جیکی کو پتہ نہیں کہاں سے آزادی نصیب ہوئی کہ پہلے تو رات کی باسی ہنڈیا میں ننھے ننھے پنجوں سے قیمہ کھُرچ کھُرچ کر چاٹا۔ پھر دُودھ کی ناند میں تھوتھنی ڈبو کر مُنہ کے راستے پیتا رہا اور بُلبلے سے بناتا رہا۔ امّی باہر نکلیں تو گویا قیامت آگئی۔ جیکی تو خیر دو تین چیخیں مار کر کوئلوں کی بوریوں کے پیچھے جا چھپا۔ لیکن دوسرے سب کہاں چھپتے! وُہ منہ بھر کے گالیاں دیں کہ سب اپنی اپنی جگہ بُت بن گئے "وہ کہاں گیا احسان کا بچہ؟" انھوں نے کڑک کر پوچھا "منہ جھُلس دوں تیرا، پاجی، بڑی سوغات اُٹھا کے لایا تھا۔ اپنی اور کوئی چیز تو لا نہ سکے یہ طباقی اُٹھا لایا۔ قربان کروں ایسے بچو کو۔ جھاڑ و پھیرے موئے کی صورت پر، نہ شکل نہ عقل، کیا مجال جو کبھی آنکھ بھی کھولی ہو جب دیکھو مؤا پڑا ہے —— اور یہ سب اسی حرام زادے خان کی کرتوت ہے بڑھ بڑھ کے باتیں بناتا تھا۔ پتہ نہیں کیا حرام حلال کھاتے ہیں سارا دن —— میں پوچھتی ہوں حرام ہی کھانا تھا تو موئے فرنگیوں سے حکومت ہی کیوں لے لی تھی —— آج یہاں یا تو جیکی رہا یا میں" پھر وُہ تیز تیز سانس لیتی ہوئی بولیں "بھرا بھرایا دیگچہ، کوئی آٹھ سیر پختہ دُودھ۔ غضب خدا کا سب کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا۔ دیکھو کس مزے سے لیٹے ہیں جیسے دُودھ نہیں نالی کا پانی پیا ہو اور سُن، خان، یا تو پھینک آ اس کو سمندر میں۔ نہیں تو باندھ اپنا بوریا بستر"

خان ہنسنے لگا۔ اس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا "امّی جہاں مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے، یوں سمجھو کہ میں اکیلا آپ کے گھر میں نہیں آیا۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی ہے" سب ہنسنے لگے اور امّی کے ہونٹ بھی پھیل گئے۔ لیکن شام کو جیکی کے خلاف بر نادیبی کارروائی عمل میں لائی گئی کہ اُسے رات کا راشن نہ ملا اور وُہ بھوک سے بیتاب ہو کر تمام رات جاگتا رہا۔ گدڑیوں کا کتا!

امتحان کے دن قریب تھے۔ منی آپا ڈھیر ساری کتابیں اپنے آگے ڈالے ناک کُریدکُرید کر نارنج یاد کیا کرتیں۔ انھیں اب نہ احسان سے اُنس رہا تھا نہ جیکی سے!

جُوں جُوں امتحان قریب آتا جاتا اُن کی بیگانگی بڑھتی جاتی - امّی صبح صبح اخبار پڑھنے بیٹھتیں تو دوپہر تک مشکل سے دوسرے صفحے پر پہنچ سکتیں - اس کے بعد ہوا کے جھونکے نیند کے جھٹکے لاتے اور وہ قالین پر گاؤ تکیہ کے سہارے لیٹ جاتیں - باجی اور آپی اپنے جہیز کی کشیدہ کاری میں مصروف ہو جاتیں - کیونکہ پہلی کاڑھی ہوئی چادریں اور غلاف میانی رہ گئے تھے - خان نوکری پر بحال ہو گیا تھا - صبح کے دس بجے جاتا اور رات کے نو دس بجے صاحب کے بنگلے سے واپس آتا - احسان کے سکول میں پڑھائی اب پہلے سے دو چند ہو گئی تھی - مشرقی پنجاب میں اتنا سارا وقت ضائع کر دینے کا تریاق انھوں نے یہی سوچا کر کراچی میں تعلیم کے اوقات بڑھا دیے جائیں - وُہ سُورج چھپے گھر واپس آتا - اس دوران میں جیکی لاکھ چیختا چلاّتا ، اپنی زنجیر دانتوں سے کاٹتا ، پنجوں سے زمین کھرچتا لیکن کچھ بن نہ پڑتی اس کے گلے میں پڑا ہُوا چمڑے کا پٹہ زنجیر سے بھی زیادہ مضبوط تھا - پہلے تو امّی ہر صبح یاد سے اُسے کھُلا چھوڑ دیا کرتی تھیں - لیکن اب وُہ نئے سرے سے گھر بسانے میں اس بُری طرح سے اُلجھ گئی تھیں کہ انھیں تن بدن کا ہوش نہ تھا - باقی لوگ جیکی میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہے تھے - ایک احسان تھا جو ہر شام اُسے گھمانے باہر لے جاتا تھا -

پھر یُوں ہوُا کہ وہ متواتر دو دن تک ایک ہی جگہ بندھا رہا - رضیہ روٹیوں کے ٹکڑے ، باسی سالن اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اس کے تسلے میں جھاڑ کر چلی آتی رہی - احسان کے سکول میں ڈرامے کی ریہرسل تھی - وُہ ابھی تک نہ لوٹا تھا - اندھیرا بڑھتا گیا اور جیکی اپنے مالک کو یاد کر کے چیخنے لگا - امّی کو جانے کیا رحم آیا - جا کے زنجیر کھول دی - وُہ پہلے تو ان کے قدموں میں لوٹا پھر اندر گھس گیا - جب امّی کمرے میں داخل ہوئیں تو وُہ قالین کو بالکل خراب کر چکا تھا اور ان کے پان دان سے تھوتھنی لگائے بڑی تیزی سے سُونگھ رہا تھا -

"ہائے رے کم بخت ، جھاڑو پھرے کمینے ، گولی لگے ، کیسے سارا قالین تباہ کر دیا" اور پھر تڑاخ سے جوتی جیکی کے سر پر پڑی - تارے ناچے اور وہ وہاں سے بھاگ کر اندر ٹرنکوں کے پیچھے جا چھُپا - امّی کا غصّہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا اور احسان سے لے کر اُس کے ابا جی تک کو ایک ہی سانس میں اتنے کوسنے ملے کہ سب کا مُنہ

اُتر گیا۔ احسان گالیوں کا یہ طومار دیکھ کر سہما سہما اندر داخل ہوا تو امّی نے چھُوٹتے ہی تھپیڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وُہ تھیرا اسکول کارڈ کا۔ ہر بار خالی دیتا رہا۔ جب اس کی امّی عاجز آ گئیں تو کان سے پکڑ کر بولیں "اب فیصلہ کر، اسی گھر میں رہے گا یا کہیں اور جائے گا؟ سوچ لے جلدی۔ اٹھا لے بستہ اور لے جا اپنے اس جوتے سوتے کو بھی۔ یا تو چھوڑ آ اسے یہاں سے بہت دُور یا پھر کوئی اور امّی ابّا تلاش کر لے۔ ہمارے یہاں تیرے لیے کچھ نہیں۔" احسان اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ وُہ امّی کی اس چڑھی ہوئی آندھی سے اچھی طرح واقف تھا۔ لیکن جب خان اندر داخل ہوا اور اسے بھی ایسی ہی صلواتیں سُننا پڑیں تو وُہ سیخ پا ہو گیا۔ آج شام اس کی ہیڈ کلرک سے جھڑپ ہو گئی تھی اور وُہ کچھ کھا کے سو رہنے کی سوچ رہا تھا۔ اور مرے پر سو دُرّے یہ کہ امّی نے آتے ہی بتّے لیے کہ برہم ہو گیا۔ پھر پٹھان کا پُوت، گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھُوت۔ سائیکل باہر نکال کر جبکی کو ٹرنکوں والی کوٹھڑی میں جا دبوچا۔ وُہ چلّایا تو اس کا گلا دبا کر سمجھا دیا کہ خان ہے احسان نہیں۔ ذرا دیر تک تو سائیکل کے پھٹپھٹاتے مڈگارڈ کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد معدوم ہو گئی۔ منی آپا نے کتابوں سے نگاہ اُٹھا کر پوچھا "امّی! سچ مچ پھینک آئے گا کیا؟" تو امّی بھنّا کر بولیں "کونسی سوغات تھی ——— ایسا بھی کیا گدڑیوں کا کتّا تھا۔۔۔۔۔"

"پر امّی۔۔۔۔۔"

"نہیں پھینک سکے آتا۔ وُہ کوئی سر پھرا تھوڑی ہے۔ یونہی گھوم گھام کے آ جائے گا اور دیکھ احسان کے بچّے اب اگر تُو نے اس کا خیال نہ رکھا تو سچ مچ پھنکوا دوں گی گندے نالے میں۔" احسان خاموش بیٹھا تھا۔ اُسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں سچ مچ خان پھینک ہی نہ آئے۔ لیکن خان اتنا بیوقوف تھوڑی تھا۔ ہندوستان سے اُٹھا کر یہاں اس لیے تو نہ لایا تھا کہ کراچی پہنچ کر پھینک دے!

آدھ گھنٹہ بعد خان واپس آ گیا۔ اس کا سانس پھُولا ہوا تھا اور چہرہ غصّہ سے لال انگارہ۔ احسان نے اُسے خالی ہاتھ اندر آتے دیکھ کر کہا۔

"سچ مچ چھوڑ آئے، خان؟"

"سچ مچ! مجھ سے یہ روز روز کی دانتا کل کل برداشت نہیں ہوتی۔ امّی کو

تو ہر بات میں میرا ہی قصور نظر آتا ہے۔ بھلا جیکی سے میرا کیا تعلق ؟ یہی نا کہ اُسے فوجیوں کی منّت خوشامد کر کے ٹرک میں سوار کرا لیا تھا —— ایک دفتر والے جینے نہیں دیتے۔ دوسرے گھر بھی عذاب بن گیا ہے —— آخر —— آخر —" پھر وُہ خود ہی رُک گیا۔

باجی نے کہا "شرم نہیں آتی۔ ایک کھاتے ہو، دوسرے غراتے ہو۔ پتہ ہے کب سے یہاں پڑے ہو ؟"

"شرم کہاں ؟" آپی روہانسی ہو کر بولیں "ہر روز دفتر سے جُوتے کھا کر آتا ہے اور یہاں سب پر رُعب گانٹھتا ہے۔"

منی آپا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا "واقعی پھینک آئے، خان ؟"

"ہاں" خان نے قاتلانہ اعتراف کیا۔

احسان پہلے تو سُسک سُسک رو دیا۔ پھر اُونچے اونچے چلّانے لگا "خان کا بچّہ —— اُلّو کا پٹھا —— تیرا کیا لیتا تھا۔ میرا جیکی تھا نا، تجھے گالیاں ملی تھیں۔ آیا بڑا معتبر —— ذرا سے بچّے کو —— ذرا سے جیکی کو —— بتا بتا —— کہاں پھینکا ہے ؟ —— کہاں چھوڑا ہے میرا جیکی ؟ —— مر جائے اللہ کرے خان کا بچّہ —— بول کہاں چھوڑا ہے ؟ بول —— میں ابھی تلاش کر کے لاؤں گا —— بتا ! بتا ! —— بتا بھی !"

"ہوبھی مارکیٹ" خان نے گردن جھکائے جواب دیا۔

"ہوبھی مارکیٹ ؟"

"ہاں"

"کہاں ہے ہوبھی مارکیٹ ؟"

"لارنس روڈ کے سرے پر"

احسان قالین کے ایک کونے پر بیٹھ کر اپنی چپلی کا فیتہ باندھنے لگا۔ اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ہونٹ بلک رہے تھے۔ ہر سانس کئی جھٹکوں سے اندر داخل ہوتا۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی اور وُہ غم و غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ جب وُہ چپلی پہن کر اُٹھ کھڑا ہوا تو امّی نے کہا "کہاں جائے گا اس وقت، دیوانی ماں کا خبطی بیٹا —— جا سو رہ ! صبح خود ہی آ جائے گا پھر پھرا کر۔ یہ کتّے آپ ہی آ جایا کرتے ہیں —— پگلا کہیں گا، جا سو رہ !"

احسان یہ سُن کر بڑی کربناک آواز سے رونے لگا۔ سب دم بخود کھڑے تھے۔ خان پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کریدنے لگا۔ توقیر بھائی نے کہا "لاؤ ہم بھی چلتے ہیں اس کی تلاش میں" احسان خوش ہوگیا۔ کتنے اچھے ہیں توقیر بھائی۔ واقعی سارے خاندان میں ایک توقیر بھائی ہی تو ہیں۔ ورنہ دوسرے تو سارے ایسے ہیں گویا بلیک مارکیٹ سے خریدے ہوئے بھائی ہوں۔ احسان کی بیتابی کا تماشا کرکے وہ پتلون پہننے لگے اور خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "کہاں ہے ہوبھی مارکیٹ؟"

"لارنس روڈ کے سرے پر!"

"لیکن وُہ تو جونا مارکیٹ ہے"

"اس سے ذرا ورے"

"اچھا! اچھا!" انھوں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا "آؤ بھئی، احسان! دو منٹ ہی کا تو راستہ ہے"

لیکن راستہ دو منٹ کا نہ تھا۔

سائیکل کا مڈگارڈ پھر پھٹپھٹایا اور اس کی آواز دُور ہوتی گئی۔

"بھائی جان، یہ خان بڑا ظالم ہے"

"سارے خان ایسے ہوتے ہیں!"

"لیکن، توقیر بھائی، اسے ترس نہ آیا؟ ——— وہاں جاکر جب اس نے جبکی کو زمین پر چھوڑا ہوگا تو وُہ اس کے پیچھے بھاگا تو ضرور ہوگا"

"ضرور!"

"اس کے بیس ناخن تھے، توقیر بھائی، اور اس کا سر اتنا بڑا تھا" احسان نے ہاتھ پھیلا کر کہا "اب پتہ نہیں بیچارہ کہاں ہوگا۔ بھائی جان اُس نے آج تک ٹریم نہ دیکھی تھی۔ وُہ میانی میں پیدا ہوا اور اب تک وہیں رہا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وُہ ٹریم کے نیچے نہ آگیا ہو۔ یہاں کے ڈرائیور چلاتے بھی تو اندھی کی طرح ہیں ——— جبکی ضرور اسی کے نیچے آگیا ہے۔ وُہ اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا ہوگا ——— لیکن توقیر بھائی! ہوبھی مارکیٹ ہے کہاں؟ وہاں اور بھی بڑے بڑے کتے ہوں گے۔ وُہ اسے مار دیں گے۔ آوارہ کتے پٹّے والے کتّے کو مار دیا کرتے

ہیں۔ مار دیتے ہیں نا؟ ان کی دُشمنی ہوتی ہے نا؟ —— پر یہ خان بڑا ظالم ہے۔ مزا تو جب تھا جکی بڑا ہو جاتا۔ پھر یہ اسے پھینک کے آتا۔" —— پھر اس نے پلٹ کر توقیر بھائی کو دیکھا جو مزے سے سگرٹ پی رہے تھے۔ بےچین ہو کر بولا۔ "توقیر بھائی! آپ کسی سے پُوچھتے تو ہیں نہیں —— ایسے گھُومنے سے ہوتھی مارکیٹ کا کیسے پتہ چلے گا؟"

پھر ایک دم وُہ بائیں بریک دبا کر چلّایا۔" ذرا ٹھہریے! سُنیئے! وُہ دیکھیے وُہ بھونک رہا ہے۔ یہ اُسی کی آواز ہے۔ آپ پہچانتے نہیں۔ جکی! جکی! چُچ! چُچ!" احسان بے قرار ہو کر ٹانگیں مارنے لگا۔" ادھر موڑیے، بھائی جان۔ اس طرف! یہاں سے آواز آتی ہے۔ ہائے صاف جکی بول رہا ہے۔ آپ پہچانتے نہیں اس کی آواز! آپ کو یہاں آئے اتنے دن ہو گئے اور آپ ابھی تک جکی کی آواز نہیں پہچان سکے۔ ذرا تیز چلائیے توقیر بھائی۔ دیکھیے! سُنیئے! بالکل جکی بول رہا ہے۔ ہائے میرا جکی —— جکی جکی!" آواز گلی کی دونوں دیواروں سے ٹکرائی اور کتّا خاموش ہو گیا۔" دیکھا، توقیر بھائی" احسان نے خوش ہو کر کہا۔ "میری آواز پہچانتا ہے۔ جکی ہے نا!"

لیکن جب توقیر بھائی نے سائیکل اس کے پاس لے جا کر روکی تو سفید رنگ کا ایک غلیظ سا پلاّ انھیں دیکھ کر غرّانے لگا۔ سائیکل سے اُتر کر احسان نے کہا۔ "بالکل ویسی آواز نکال رہا تھا۔" اور مایوس ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ گلی کے موڑ پر دُودھ کا گرم گرم گلاس اٹھائے ایک آدمی سے اس نے پوچھا۔" ہوتھی مارکٹ کہاں ہے؟" تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ احسان پھر خاموش ہو کر چلنے لگا۔ توقیر بھائی نے رائے دی کہ سائیکل پر سوار ہو کر چکّر لگاتے جائیں۔ نہیں تو دیر ہو جائے گی اور پلاّ کہیں دُور نکل جائے گا۔ مگر اُس نے سُنا نہیں۔ ایسے ہی چلتا رہا۔ بہت سے کتّے ادھر اُدھر کھیل رہے تھے مگر اُن میں جکی نہیں تھا۔ کوئی بہت بڑا تھا کوئی بہت چھوٹا۔ جکی کے جسم کا ایک بھی کتا نہ تھا۔ کھمبے کے نیچے کھڑے ہو کر ایک داڑھی والے آدمی سے اس نے پوچھا۔" ہوتھی مارکیٹ کہاں ہے؟"

"چُو؟"

"میں ہوتھی مارکیٹ کا راستہ پُوچھتا ہُوں۔ ہمارا کتا گم ہو گیا ہے۔ اس کا

نام جیکی تھا۔ یہ میرے بھائی ہیں۔ ہم اپنے کتّے کو تلاش کر رہے ہیں۔ خان اُسے ہوتھی مارکیٹ پھینک آیا ہے اور ہمیں مارکیٹ کا پتہ نہیں . . . . "

" ہوتھی مارکیٹ ڈانھن اھي رستو ٿو وڃي "

احسان پھر چلنے لگا تو توقیر بھائی نے اس کا کندھا ہلا کر سائیکل پر بیٹھنے کو کہا اور جب وُہ سوار ہو گئے تو وُہ آدمی اُنھیں دیر تک دیکھتا رہا۔

لارنس روڈ سے حاجی کیمپ کو مُڑتے ہُوئے احسان سائیکل سے ایک دم پھسل پڑا اور چلّایا "وُہ رہا سامنے۔ توقیر بھائی، وُہ"! اور واقعی جیکی سامنے کھڑا تھا۔ بھورا رنگ۔ دُبلا جسم اور پتلی مو قلم سی دُم! سائیکل کو اپنے قریب آتے دیکھ کر وُہ خوف سے ایک طرف بھاگا۔ احسان چلّایا "جیکی! جیکی!" مگر اُس نے کوئی توجّہ نہ دی اور جب وُہ بجلی کے ایک بلب کی روشنی تلے سے گذرا تو احسان رُک گیا۔ وُہ جیکی نہیں تھا۔ سیاہ بالوں والا کوئی آوارہ پلّا تھا۔ اس کے گلے میں کوئی پٹہ نہ تھا اور اس کی چال وحشت ناک تھی۔ دیوار سے اُپلے اُتارتی ہوئی ایک عورت سے اُس نے پُوچھا "مائی، ہوتھی مارکیٹ کدھر ہے"؟ تو وہ نہایت نرم لہجے میں بولی۔ " پتہ نہیں بیرا اسی ناں پنائی آں " وُہ پھر اُپلے اتارنے لگی۔ احسان مایوس ہو کر رُک گیا۔ خان بہت بُرا آدمی ہے، اُس نے سوچا۔ اُسے ایسی جگہ لے جا کر پھینکا جس کا کسی کو علم ہی نہیں۔ پھر وُہ ہر راہ گیر کو روک کر پوچھتا رہا مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ سائیکل کے پاس آکر اُس نے توقیر بھائی سے کہا "اگر ہوتھی مارکیٹ میں بڑے کتّے نہیں ہیں تو وُہ زندہ ہے اور جا کر چھوٹے کتّوں کا سردار بن گیا ہے کیونکہ اس کا سر بہت بڑا ہے۔ نور دین نے مجھے بتایا تھا۔ ایسے کتّے ریچھ کا شکار کیا کرتے ہیں۔ لیکن اگر . . . . یہ بڑے کتّے تو ہر جگہ ہوتے ہیں" پھر وُہ خود ہی خاموش ہو گیا اور آہستہ سے اُچک کر سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔

سڑکیں سنسان ہوتی گئیں اور پھٹپھٹاتی ہوئی سائیکل ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ لارنس روڈ، لالوکھو روڈ، نسرواں جی سٹریٹ، آدم جی لین، گاڑی کھاتہ اور راما سوامی بہت سے پلّے جیکی کی طرح بھونک رہے تھے۔ بہت سوں کا رنگ اس جیسا تھا۔ اکثر اس جیسے نحیف اور کمزور تھے۔ کوئی کوئی شاید بڑے سردار بھی تھا۔ کسی کی چال ایسی تھی۔ کوئی بھاگتا اسی انداز سے تھا۔ لیکن جیکی کوئی نہیں تھا۔

اسی طرح گھومتے گھومتے بارہ بج گئے۔ لارنس روڈ ویران ہو گئی۔ سینما کے تماشائی گذر گئے۔ سپاہی گھومنے لگے اور کتّے اپنی کمین گاہوں میں دبک کر سو گئے۔

"چلیے اب واپس چلیں" احسان نے پیچھے مڑ کر توقیر سے کہا۔ "بہت رات ہو گئی ـــــ اب جیکی نہیں ملے گا۔ مجھے پتہ ہے یا تو اُسے بڑے کتّے پھاڑ دیں گے یا وہ خود ٹریم کے نیچے آ کر کچلا جائے گا۔ ہم اُسے نہیں ڈھونڈ سکتے ـــــ امّی کہتی تھیں۔ پھر پھرا کر خود ہی آ جائے گا۔ لیکن وہ کیوں آئے۔ ہمارے یہاں کون اس سے پیار کرتا تھا ـــــ لیکن جیکی زندہ نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے وُہ مر گیا ہے ورنہ اتنی تلاش ضرور اس کا پتہ بتا دیتی۔ اگر وُہ زندہ ہوتا تو ضرور میری آواز سنتا۔ لیکن وہ زندہ نہیں ـــــ کوئی گلی کے کتّے کو کب پالتا ہے اور کسی کو کیا خبر کہ وُہ آوارہ کتا نہیں۔ خان کا بھی اُس میں کیا قصور ہے۔ جب اللہ میاں مارنے والا ہو تو ہم خان کو بُرا کیوں کہیں۔ امّی! ـــــ لیکن اس نے اگر قالین پر پیشاب کر دیا تھا تو کیا ہوا۔ میں خود دھو دیتا" پھر اس کے آنسو ڈھلکنے لگے "پر جیکی! وہ زندہ نہیں اگر وُہ زندہ ہوتا تو میری آواز سُن کر بھاگا آتا۔ آپ کو پہچان لیتا۔ کتّے تو بُو سونگھ کر میلوں دُور چلے جایا کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دیکھیے، توقیر بھائی، یہ وہ جگہ ہے جہاں ہماری بڑی ماں ٹریم سے ٹکرا کر مری تھیں وُہ یہاں اللہ دین نائی سے پھوڑے پر مرہم لگوانے آئی تھیں اور ایک گھنٹے میں ان کی لاش ہمارے گھر پہنچ گئی تھی۔ بڑی ماں نے بھی ٹریم پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ مرہم لگوانے ہر روز دکھڑ دیہ پر جایا کرتی تھیں پر اس دن پتہ نہیں ان کے جی میں کیا آئی کہ ہماری طرح بھاگ کر چڑھنے لگیں۔ پاؤں پھسلا اور گرتے ہی بس ختم ہو گئیں اور جیکی تو کے گھنٹے سے گم ہے لیکن مجھے پتہ ہے۔ وُہ گم نہیں۔ مجھے پتہ ہے وُہ گم نہیں۔"

پیر بخاری کے مزار سے گذرتے ہوئے احسان نے کہا۔ "ذرا رکیے بھائی جان، ذرا سی دیر کے لیے" اور جب سائیکل رُکی تو وہ درگاہ کی چھوٹی سی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا اور اپنی جیب سے کچھ نکال کر اور قبر پر رکھ کر دُعا مانگنے لگا۔ دیر تک وُہ اسی طرح لب ہلاتا رہا۔ اس کے ریشمی گھنگھریالے بال چوراہے کی بجلی میں بیچ در بیچ سنہری آرزوؤں کی طرح جلتے بجھتے معلوم ہوتے تھے۔ پھر پھڑاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور تیزی سے ہونکتے ہوئے نتھنے اس کے ضبط کی

غمازی کر رہے تھے اور جب وہ دیوار پھاند کر باہر آنے لگا تو بولا "توقیر بھائی، پیر بخاری کرے اگر وہ زندہ ہے تو آرام سے رہے۔ اسے کوئی صاحب پال لے یا وُہ کتوں کا سردار بن جائے ——— قرآن شریف کی قسم! میں نے پانچ پیسے اس لیے نہیں چڑھائے کہ وُہ مجھے واپس مل جائے بلکہ اس لیے چڑھائے ہیں کہ جیکی زندہ رہے اور کوئی اُسے تکلیف نہ پہنچائے۔ پیر بخاری سب کی بات پوری کر دیتے ہیں۔ شاید میری ——— میری بھی ———" پھر اس کی آواز بھر آگئی اور اس کی آنکھوں میں پانی جھلملانے لگا۔ باہر آنے سے پہلے اس نے اپنی جیب میں پھر ہاتھ ڈالا اور بولا "ایک پیسہ رہ گیا ہے۔ اسے بھی چڑھائے دیتا ہوں۔ شاید جیکی زندہ۔ شاید وُہ زندہ رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !"

اور جب وُہ باہر آیا تو پھر رونے لگا، اسی شدّت سے جب وُہ گھر سے نکلتے وقت رو یا تھا۔ اس کا سانس پھر ہچکولے لینے لگا اور وُہ سِسکیاں بھرتا سائیکل پر بیٹھ گیا۔

ایک بج چکا تھا۔ ساری کالونی سو چکی تھی۔ صرف باجی لالٹین سیڑھیوں پر رکھے برآمدے کے ستون سے لگی بیٹھی تھی۔ جب وُہ دونوں سامنے سے آتے دکھائی دیے تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور لالٹین اُٹھا کر اندر چلی گئی۔ برآمدے میں ابا جی، انوار بھائی، خان اور انصار بھائی خراٹے لے رہے تھے۔ اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے توقیر نے احسان کو دیکھا۔ وُہ چادر کندھوں پر ڈالے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ "اب سو رہو، احسان"۔ انھوں نے کمبل لپیٹ کر کہا "کل پھر کوشش کریں گے"۔ احسان نے کوئی جواب نہ دیا اور چُپ چاپ ویسے ہی لیٹ گیا۔

یہ شبِ ماہ نہ تھی۔ اس وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن سمندر کے کنارے گھٹا ٹوپ اندھیرا کبھی نہیں چھاتا۔ ستاروں کی روشنی سمندر میں منعکس ہو کر تاریکی کو سُرمئی بنا دیتی ہے یا وُہ اُجالا ہی مٹیالا سا ہوتا ہے۔

توقیر سو گیا!

کوارٹر کے باہر بندھی ہوئی بھینس جُگالی کر رہی تھی۔ اس کی کٹیا لکڑی کے ڈبے پر تھوتھنی ٹکائے سو رہی تھی۔ خان کے خرّاٹوں میں چاقو تیز کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انوار بھائی سوتے میں انگریزی بولنے لگے اور دیر تک بولتے رہے۔ ہوا

کی تیزی سے برآمدے کے پردے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ایک عجیب طرح کا بے چین سا سکوت تھا۔ ہر ایک کی سانس آواز دے رہی تھی اور ہر ایک چُپ چاپ سویا ہُوا تھا۔ احسان نے دو چار کروٹیں بدلیں اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا اور جیکی کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کی پیدائش، پرورش، اس کی طویل بیماری، اس کے معرکے اس کی سمجھداری، بہادری، جان نثاری، فرض کی ادائیگی اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ اس کے ذہن میں کوہِ قاف کی پریوں کی طرح تھرکنے لگا۔ اُسے جیکی کی زندگی کا ایک ایک دن یاد آ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک ثانیہ! اُس کا دل اُونچے اُونچے رونے کو چاہ رہا تھا۔ پر سارے سو رہے تھے۔ وُہ دل میں جیکی کی لمبی عُمر اور روشن مستقبل کی دُعائیں مانگنے لگا۔ ایسی دُعائیں جن سے مشیّت کو ذرا بھی دلچسپی نہیں! سوچتے سوچتے اُسے بہت سی ایسی چیزیں یاد آگئیں جو کعبہ کے قادر نے تلاش کر دی تھیں۔ وُہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں موند کر وظیفہ کرنے لگا۔

یا کعبے کے قادر!

میرا جیکی کر دے حاضر

ایک گھنٹہ دو گھنٹہ اور پتہ نہیں کتنی دیر تک اور وُہ یہی وظیفہ کرتا رہا۔ گلی میں ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ ہوئی اور جیکی بھینس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ احسان چارپائی سے ایک دم اُچھلا اور چلّایا "جیکی!" جیکی اس کی زقند سے ہڑبڑا کر بھاگا اور وُہ اس کے پیچھے جیکی! جیکی! کے نعرے مارتا دوڑا۔ ننگے پاؤں، ننگے سر، وُہ جیکی کے پیچھے شور مچاتا بگٹٹ جا رہا تھا۔ توقیر اس کی آواز سُن کر اُٹھ بیٹھا اور اسی طرح برہنہ پا اس کے پیچھے بھاگا۔ لیکن احسان اور جیکی کالونی کی حدیں پار کر کے ندی کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ پھر ندی گذر گئی۔ گولی مار گاؤں آگیا گھنا باغ، عیسائیوں کی قبریں۔ وُہ جیکی کے پیچھے دیوانہ وار بڑھتا چلا گیا۔ پہلے پہل توقیر کو اس کی آواز سُنائی دیتی رہی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ جیسے کنوئیں میں ڈوب گئی —— وُہ اپنے اندازے لگا کر پیچھا کرتا رہا۔ اُونچی نیچی بھربھری چٹانیں پیچ کھاتی ہوئی ندی، کوڑے کے ڈھیر، خار دار تھوہر، قبرستان، املی کے درخت، ہڈیوں کا کارخانہ وُہ ان کے گرد و نواح میں گھومتا رہا۔ آوازیں دیتا رہا۔ جھونپڑیوں کے باہر سوئے ہوئے آدمیوں کو جگا جگا کر پوچھتا رہا مگر بے سُود تھی کہ اس کے

پاؤں زخمی ہو گئے، گلا بیٹھ گیا اور اس کی ہمّت نے جواب دے دیا۔ پَو پھٹے تو قیر گھر واپس آیا۔ سب برآمدے میں جمع تھے۔ باجی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی۔ آپی اور منی آپا کے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ صرف امّی چُپ تھیں۔ انوار بھائی سائیکل پر سوار ہو کر کہیں روانہ ہو چکے تھے۔ خان نے لاٹھی ہاتھ میں لے کر دروازے پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور چل دیا۔ اس نے تہیّہ کر لیا کہ اگر احسان نہ ملا تو گھر واپس نہ آئے گا۔ ابّا جی نے وکٹوریہ میں بیٹھتے ہوئے کوچوان سے کہا "مجھے کچھ خبر نہیں۔ جہاں تمھارا دل چاہے لے چلو" جب وکٹوریہ چل دی تو باجی کے ساتھ آپی اور منی آپا بھی چیخیں مارنے لگیں۔ امّی نے انھیں اس طرح سے چلّانے دیکھ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا اور پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ سامنے کھڑکی کی سلاخ میں زنجیر اسی طرح لٹک رہی تھی۔ ایلومینیم کا کٹورا فرش پر اُوندھا پڑا تھا اور احسان کی چارپائی پر اُس کے سُرخ کنارے والی چادر کفن کی طرح پڑی تھی۔ امّی نے جھٹ سے وہ چادر اُچک کر سر پر ڈال لی اور پھر ایکا ایکی برآمدے سے ننگے پاؤں باہر نکل گئیں۔ انھیں اس طرح جاتے دیکھ کر چیخیں اچانک تھم گئیں لیکن کسی کو انھیں آواز دینے کی ہمّت نہ ہوئی۔

پیر بخاری کے سبز غلاف کو بوسہ دے کر امّی نے سوا روپیہ وہیں رکھ دیا۔ جہاں پہلے چھ پیسے پڑے تھے اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں!

سنگ دل

خداداد چبوترے پر بیٹھا سٹین گن کے دستے سے کوئلے توڑ توڑ کر انگیٹھی میں ڈال رہا تھا۔ ایک کونے میں نون مرچ رگڑنے کا ڈنڈا اکھڑا تھا اور دوسرے میں آٹے کا کنستر پڑا تھا جو انڈین پینل کوڈ کی جلد سے ڈھکا تھا۔ چھلنی میں سرخ سرخ مرچیں، نمک کی ڈلیاں اور ہلدی کی گرہیں پڑی تھیں۔ دسترخوان کا ایک کونہ ان پر تھا اور دوسرا گندھے ہوئے آٹے پر۔ سالن کا ایک حصّہ پک چکا تھا اور باقی دیگچیوں میں پڑا تھا۔ کوئلے توڑتے توڑتے خداداد نے سر اٹھا کر اندر بیٹھی ہوئی بازیافتہ لڑکیوں سے پوچھا "گوشت بھوننا جانتی ہو؟"

ایک نے مدھم آواز میں جواب دیا "اُوں ہُوں"

دوسری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ٹماٹر، پیاز اور پودینہ کا کچومر بنا لوگی؟"

اس دفعہ دونوں خاموش رہیں۔

"تو پھر حقّہ ہی تازہ کرو۔"

"اچھا!" وہ دونوں یک زبان ہو کر بولیں اور ایک ساتھ اُٹھ کر اندر سے حُقّہ اور چلم اُٹھا لائیں۔ ایک نے ڈرتے ڈرتے سٹین گن کا میگزین پانی کے لوٹے پر سے اُٹھایا اور طاق میں رکھ دیا اور آہستہ آہستہ پانی چھوڑ کر حقّہ تازہ کرنے لگی۔ دوسری نے طاق میں پڑے ہوئے میگزین کو دُور ہی سے دیکھا اور چلم کا چنبل سونگھتے ہوئے بولی "چچا، تمباکو کہاں ہے؟"

"تمباکو!" خداداد نے حیرت سے پوچھا اور پھر ہاں! ہاں! کرتے ہوئے نمد کے ڈبے سے ایک پُڑیا نکال کر بولا "ذرا کم ڈالنا تمباکو ——— یہاں تو گھڑی گھڑی بازار بھی نہیں جا سکتے ——— اور دیکھو اچھی طرح دبا دبا کر بھرنا ——— پانی کے دو قطرے ٹپکا لوگی تو چلم دیر تک چلے گی۔"

پھر وُہ انگیٹھی میں کوئلے چُننے لگا اور وُہ لڑکی بیٹھ کر تمباکو مسلنے لگی۔ اتنے عرصے کے بعد آج ان کے چہروں پر ذرا بات پیدا ہوئی تھی۔ تمباکو کی مانوس خوشبو شاید انہیں اس وقت کی یاد دلانے لگی جب ان کا باپ انہیں نمبردار کے لڑکے کی آمد پر حقہ تازہ کرنے کو کہا کرتا ہوگا ــــــــ حقے کی نے میں چھونکتے ہوئے اور چلم کی کوکھ میں تمباکو جماتے ہوئے یہ دن یاد کر کے ان کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ دونوں بہنیں تھیں!

میں بیٹھک میں چارپائی پر نیم دراز سرکاری روزنامچہ لکھ رہا تھا۔ بیّ کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے ایک نظر اُسے دیکھ کر باہر گلی میں نگاہ دوڑائی۔ حیوانات کے شفاخانے کے پاس میں نے جانی پہچانی صورت دیکھی۔

"تایا جی آرہے ہیں" یہ کہہ کر بیّ جیسے آئی تھی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تایا جی آئے۔ انھوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"سب سامان پہنچ گیا؟"

"جی!" میں چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر خداداد کو دیکھنے لگا۔

انھوں نے کوٹھڑی کی کھڑکی میں جھانک کر پوچھا "محمد خان کہاں گیا ہے؟"

"ڈاک بنگلہ گیا ہے۔ میری مسہری اور چند ضروری کاغذات لینے"

"تو گویا تم سارے کاغذات اپنے ساتھ نہیں لائے"

میں نے جھینپ کر کہا "جی نہیں۔ مجھے ایک الماری کا خیال ہی نہ رہا تھا"

"بے پروا کہیں کے!" اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے وُہ اندر چلے گئے۔ ابا جان کے بعد اگر مجھے کسی سے خوف آتا تھا تو وُہ تایا جی تھے۔

جس دن ابا جان سب اسسٹنٹ سرجن لگ کر یہاں آئے تھے اُسی دن تایا جی سب انسپکٹر پولیس تعینات ہوئے۔ دونوں کی ملاقات ریل گاڑی میں ہوئی اور یہ واقفیت بڑھتے بڑھتے گہری دوستی میں تبدیل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو تھانے اور ہسپتال کا قرب تھا۔ پھر دونوں کی سخت گیر طبیعت! دوپہر کو مریضوں سے فارغ ہو کر ابا جان تھانے جا بیٹھتے اور شام کو تایا جی ہمارے کوارٹر کے آگے کرسی ڈال کر انتظار کرنے لگتے کہ کب ان ڈور مریضوں کا معائنہ ختم ہو اور ابا جان گولڈ فلیک کا ڈبہ لے کر ان کے پاس آبیٹھیں۔ جب امی نے بیّ کی بی بی کو آہستہ آہستہ پان کھانے

کا عادی کر لیا تو میں اور پتّی چُھپکے چُھپکے گھر سے نکل کر تھانے کے پچھواڑے "دگّی" میں چلے جاتے جہاں بیریوں، گوندنیوں اور سرس کے درختوں کے درمیان سبزی کے چوکور قطعے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم جانے کتنی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے ـــــ خورد سال شیشم کے گہرے سبز پتّے توڑ کر میں اُسے پیپنیاں بنا کر دیتا جو اس سے کبھی نہ بجتی تھیں۔ مینڈھ پر بیٹھے بیٹھے وُہ سفید سفید تیز ابی مُولیاں اُکھاڑ کر اپنی اوڑھنی سے پُونچھتی اور چاکلیٹ کی طرح کھانے لگتی جنھیں میں آج تک اس اطمینان سے نہیں کھا سکا۔ ایک بار بڑی خوشامدوں کے بعد اُس نے مجھے اپنی ادھ کھائی مُولی کھانے کی اجازت دی تھی اور میں اسے آہستہ آہستہ چبا رہا تھا۔ جیسے ننھے ننھے بوسوں کے نمکین قتلے ہوں۔

پُورے آٹھ سال کے بعد پتا جی کی تبدیلی ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی بار آس پاس کے تھانوں میں ریلیونگ ڈیوٹی پر تعینات ہوتے رہے لیکن وہ کُنبے کو اپنے ساتھ نہ لے جاتے تھے مگر آخری مرتبہ ان کے آرڈر لائل پور کے نکلے اور پتّی چلی گئی۔

ابّا جان اور پتا جی کی خط و کتابت باقاعدہ جاری رہی۔ میں بھی اُدھر سے آیا ہوا ہر خط میز کے دراز سے نکال کر ضرور پڑھتا لیکن اس میں کوئی بات ایسی نہ ہوتی جس سے میری تسکین ہو سکتی۔ امّی اور بی بی کے تحائف پارسل آتے جاتے تھے لیکن ان میں چِٹھیاں نہ ہوتی تھیں ـــــ تھوڑے عرصے کے بعد ابّا جان بھی تبدیل ہو گئے اور ہم سب جالندھر چلے گئے۔ یہاں امّی کو ایک اور بی بی مل گئیں جو پان کھانے میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ ابّا جان کو ایک اور سگرٹ نوش دوست مِل گئے لیکن میرے لیے مُولیاں بدستور تلخ رہیں بلکہ ان کی تلخی میں اضافہ ہو گیا۔ قیامِ جالندھر کے دوران میں ایک دفعہ پتا جی آ کر ہم سے ملے لیکن اکیلے۔ وُہ انسپکٹر ہو گئے اور پھلور جا رہے تھے۔

اس عرصے میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جس دن مجھے کمشن ملا ابّا جان اسی دن پنشن لے کر گاؤں چلے گئے۔ لڑائی جاری رہی اور ہم دلیس بدلیس کی سیر کرتے اور مُلک مُلک کا پانی پیتے دادِ شجاعت دیتے رہے۔ پورے چار سال بعد جب اپنے وطن کا پھیرا ہوا تو جنگِ عظیم کی چھوٹی بہن خانہ جنگی ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکی تھی

ملک تقسیم ہوا اور پنجاب کا ہر علاقہ میدانِ کارزار بن گیا ——— ایک غیر معین عرصہ کے لیے مجھے مشرقی پنجاب سے مغویہ عورتیں برآمد کرانے کے لیے اسی جگہ ڈسٹرکٹ لیاژان آفیسر بنا کر بھیجا گیا جہاں میں نے اور رمیؔ نے آٹھ سال اکٹھے بتائے تھے۔ اس پیاری زمین سے کچھ اس درجہ اُنس ہو گیا تھا کہ میں نے پورے محافظ دستے کا ساتھ ضروری نہ سمجھا۔ صرف دو سپاہی خداداد اور محمد خاں ساتھ لیے۔ موٹر میں خود چلاتا تھا۔

مکمل دو دن ڈاک بنگلے میں ضائع کرنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ یہاں کے انسپکٹر پولیس پنّا جی ہیں۔ فوراً تھانے پہنچا۔ انھوں نے گذشتہ دو دن ڈاک بنگلہ میں گذارنے پر سخت سرزنش کی اور میں اُن کے یہاں اُٹھ آیا۔ مجھے پنّا جی کی جابر طبیعت سے بہت ڈر لگتا تھا۔

رپورٹ کو مخصوص سرکاری لفافے میں بند کر کے میں نے خداداد سے کہا "پہلے اسے ڈاک گھر لے جاؤ۔ روٹی پھر پکا لینا"

اُس نے پالک کاٹتے ہوئے سر اُوپر اُٹھایا اور دردی آواز میں بولا "لیکن ابھی ہنڈیا کہاں پکی ہے جناب"

میں نے جھلّا کر لفافہ میز پر ڈال دیا اور سیٹی بجانے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وُہ ایک ہنڈیا ہمیشہ چار حصّوں میں پکایا کرتا ہے ——— خداداد نے ایک دیگچی میں آلو اُبال رکھے تھے۔ دُوسری میں پالک اُبال رہا تھا۔ اس کے بعد وُہ ان دونوں کو ایک بڑی دیگچی میں ڈال کر ہلانے والا تھا۔ مصالحہ بھُون کر تیسری دیگچی کا مواد وُہ اس میں اُنڈیلے گا۔ لیجیے صاحب سالن تیار ہے۔ اس دوران میں اگر سیٹی نہ بجے تو اور کیا ہو!

محمد خان ڈاک بنگلے سے باقی ماندہ کاغذات لے کر گھر آیا تو اس نے بتایا کہ چیف لیاژان آفیسر تین ٹرک لے کر برقندی گئے ہیں اور مجھے وہاں ملنے کو کہا ہے۔ ضروری کاغذات کی چھان بین میں مجھے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ جاتے ہوئے میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنے چلنے کی اطلاع اندر بھیجی۔ پنّا جی سُرخ کنارے والی دھوتی اور سفید ململ کا کلیوں والا کُرتہ پہنے باہر آئے اور کہنے لگے "سوچ سمجھ کر چلا کرو بھائی۔ نہ زیادہ بے باکی اچھی ہے نہ سُست روی! میں ٹرک میں سوار

ہونے لگا تو امر نے میری پتلون تھام کر کہا: "بھا پاجی میرے لیے ٹافیاں لانا"۔ یہ بتا جی کا لڑکا تھا۔ پمی سے سات سال چھوٹا۔

چھوٹے پر خداداد ہنڈیا کا چوتھا حصّہ ابھی تک پکا رہا تھا۔

برقندی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ نہایت خوبصورت اور پُرفضا۔ جوہڑ کے ارد گرد نیم کے جھنڈوں میں چڑیوں کے غول دوپہر تک شور مچاتے رہتے ہیں۔ اور دن بھر جُگالی کرتے جانور درختوں کی چھاؤں میں پانی کے اندر بیٹھے رہتے ہیں اور لوگوں کے چہرے گو بیماری، موت اور نباہ دے کی صعوبتوں سے اُترے ہوئے تھے تاہم کبھی کبھی ان میں زندگی کی کوئی شوخی اپنی جھلک دکھا جاتی۔ ایسی جگہ مغویہ لڑکیاں برآمد کراتے پھرنا ایک بے کیف سی عبادت تھی۔

پورے تین دنوں کے بعد میں صبح دس بجے گھر لوٹا۔ بیٹھک کا دروازہ بند کر کے بوٹوں سمیت چارپائی پر دراز ہو گیا۔ دھول کی یورش اور صبح صبح پسینہ کی ہلکی ہلکی نمو نے کچھ بے جان سا کر دیا تھا۔ بڑی ہمّت سے اُٹھ کر ہاتھ مُنہ دھویا تو احساس ہُوا کہ ڈاڑھی مونڈے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ ابھی سیفٹی ریزر میں بلیڈ لگایا ہی تھا کہ پمی کی آہٹ نے چونکا دیا۔

"لائیے میں آپ کی شیو بناؤں"۔

"شیو؟ پر یہ تو بڑی مہارت کا کام ہے۔ تم سے . . . . ."

"مہارت نہ مہارت۔ لائیے ریزر دیجیے"۔

اور وُہ شیو بنانے لگی۔ کبھی اس کی لٹ سر سے پھسل کر ٹھوڑی کے نیچے جھولنے لگتی اور کبھی کندھوں پر پڑا ہُوا سفید جارجٹ کا دوپٹہ سرک آتا۔ وُہ گھڑی گھڑی ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر درست کرتی۔ لیکن وُہ پھر ڈھلک آتے۔ آخر تنگ آ کر اُس نے اپنا دوپٹہ اُتار کر ساتھ والی تپائی پر ڈال دیا اور جھُولتی ہوئی لٹ کی پروا نہ کرتے جلدی جلدی شیو بنانے لگی۔ لیکن ٹھوڑی کے خم کے بال ہر بار بے مُونڈے رہ جاتے۔ اُس نے بُرش اُٹھا کر ایک دم بہت سا صابن لگا دیا۔ پھر دبا کر ریزر جو پھیرا تو ٹھوڑی کے گڑھے سے خُون کے ایک قطرے نے سر نکالا اور احمریں قمقمے کی طرح لٹک گیا۔ اُس نے گھبرا کر ریزر میز پر رکھا اور تپائی سے دوپٹہ اُٹھا کر اور گولا سا بنا کر میری ٹھوڑی کے ساتھ دبا دیا۔ تھوڑی دیر

کے بعد کپڑا ہٹا کر بولی "خود ہی لیجیے یہ خوں فشانیاں۔ ہم سے ایسا پاپ نہیں ہوتا۔"

جب وُہ چلی گئی تو میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ٹھوڑی سے ایک ننھا ساعُنابی سونا چھوٹا اور مقناطیس سے چمٹی ہوئی لوہ چُون ایسی داڑھی میں یاقوت کی ایک کرچی سی جگمگانے لگی —— ٹپ! ٹپ! ٹپ! اور تین یاقوت میز پر پڑے تھے۔

شام کو پتا جی مجھے یہ آرڈر دے کر دورے پر چلے گئے کہ میں ان کی غیر موجودگی میں باہر ہرگز نہ سوؤں۔ کمرے کا پنکھا رات بھر چلتا رہے اور کھڑکیاں اور روشندان کھُلے رہیں۔ سب ٹھیک ہونے پر بھی انھیں میری جان کا خطرہ تھا۔ وُہ چلے گئے تو امرؔ آکر مُنہ بسورنے لگا "بھاپا جی آپ میرے لیے ٹافیاں کیوں نہیں لائے ؟"

"ٹافیاں ؟ یار ٹافیاں وہاں کہاں۔ برفندی تو ایک گاؤں ہے چھوٹا سا۔"

"تو پھر مجھے پیسے دیجیے۔ میں خود لے آؤں گا۔"

"میرے پاس اس وقت کھُلے پیسے نہیں" میں نے بٹوا دیکھا "ممّی سے لے لو۔"

"وُہ نہیں دے گی۔"

"دے گی کیوں نہیں۔ تم میرا نام لے کر مانگنا۔"

"وُہ جب بھی نہیں دے گی۔"

"تو اُسے یہاں بُلا لاؤ۔"

"اچھا!"

ممّی نے آکر بتایا کہ جب سے بی بی کا انتقال ہو گیا ہے امرؔ بہت ضدی ہو گیا ہے۔ پتا جی اس سے بہُت لاڈ کرنے لگے ہیں اور یہ بگڑتا جاتا ہے۔ سارا دن نانی کو تنگ کرتا ہے۔ نوکروں سے جھگڑتا ہے۔ گندے لڑکوں سے کھیلتا ہے اور حد درجے کا چٹورا بن گیا ہے۔ اگر مجھ سے خوف نہ کھاتا ہو تو سکول جانا بھی چھوڑ دے۔" لیکن جب میری سفارش پر وُہ ممّی سے دو آنے لے کر بھاگ گیا تو میں نے کہا "اسے ابّا جان کے پاس لے جاؤں ؟"

"ابّا جان اب بھی مارتے ہیں کیا ——— اُسی طرح ؟"

"ہاں ہاں اُسی طرح" میں مسکرایا "بلکہ اب تو ان کا غصّہ اور بھی تیز ہو گیا ہے۔"

"سچ !" پمی ایک دم جذباتی ہو گئی "ہائے میرا دل ابّا جان سے ملنے کو کتنا ترستا ہے"

"تو چلو پھر"

یہ سُن کر وُہ مُسکرانے لگی اور سر ہلا کر بولی "اُوں ہُوں"

میں نے کہا "پمی، یاد ہے نا ۔ ابّا جان نے ایک دفعہ تمھیں بھی پیٹا تھا"

"ہاں ہاں !" اُس نے آنکھیں میچ لیں "یہاں چھڑی لگی تھی اُن کی - آدھی کمر پر اور آدھی بازو پر - لیکن ساری شرارت تو تمھاری تھی - تمھیں نے تو مجھے کیچڑ کے گھروندے بنانے کی ترغیب دی تھی - تم بڑے شریر تھے جب"

"اور اب ؟"

"اب تو خیر اچھے ہو - سرکاری ملازم ہو - بی - اے پاس ہو ——— ہاں سچ تم نے بی - اے کیسے پاس کر لیا ؟"

"جیسے کیا کرتے ہیں"

"نقل اڑا کر ؟"

"نہیں تو"

"میٹرک میں تو تم نے خوب نقل اڑائی تھی"

"میٹرک کی باتیں چھوڑو - بی - اے میں ریاضی نہیں تھی نا"

پمی ہنس پڑی "اگر میٹرک میں ہاؤس ہولڈ اکاؤنٹس نہ ہوتا تو میں کبھی اسے پاس نہ کر سکتی - بھلا گھر بیٹھے کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ ایک نالی جب حوض کو دو گھنٹے میں خالی کر دیتی ہے تو دُوسری نالی اسی حوض کو کتنے عرصے میں خالی کر دے گی"

یہ کہہ کر وُہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی اور آہستگی سے کہا "میں اب جاتی ہوں نانی اماں ادھر آ جائیں گی تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی - پُرانے خیال کی عورت ہیں نا"

"جیسے تمھاری مرضی - لیکن شام کو ہم "دلگن" ضرور چلیں گے - میں تمھیں وہاں ایک چیز دکھاؤں گا اور ہم اتنی ساری باتیں کریں گے" میں نے ہاتھ کھول کر کہا -

"اتنی ساری۔"

جس اچانک پنے سے وہ اٹھی تھی اسی اچانک پن سے بیٹھ کر بولی "تمھیں اس شعر کا مطلب آتا ہے؟

جو بات دل میں رہ گئی نشتر بنی حفیظؔ
جو لب پہ آگئی رسن و دار ہو گئی

میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا "لیکن تم اس شعر کا مطلب سمجھ کر کیا لوگی؟ اسے ایسے ہی رہنے دو۔ شعر سمجھ میں آنے لگیں تو انسان کی روح بے چین ہو جایا کرتی ہے۔"

وہ بھی کچھ دیر سوچ کر بولی "میں نے پتاجی کی الماری سے اکثر شاعروں کی کتابیں نکال نکال کر پڑھی ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ دل کہتا ہے۔ خوب ہے۔ دماغ کو شکوہ رہتا ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔"

میں نے بے تکے پن سے کہا "مجھے ڈر ہے کسی دن تم خود شعر نہ کہنے لگو۔"

اُس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "تمھیں یاد ہے، جب تم "دگن" کے کنوئیں میں اُتر کر میرا دوپٹہ نکالنے گئے تھے اور مجھے بھی ساتھ آنے کو کہا تھا تو میں نے کیا جواب دیا تھا —— میری بالکل وہی حالت ہے —— مجھے زندگی جس قدر عزیز ہے موت سے میں اتنی ہی خائف ہوں۔ لیکن کبھی کبھی اپنے آپ میرے منہ سے یہ نکل جاتا ہے۔ اے خدا! مجھ سے ایک غزل لکھوا دے چھوٹی بحر کی چھوٹی سی غزل۔ اس کے بعد چاہے تو مجھے موت ہی دے دے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی "الیف۔اے میں تمھیں شاید معلوم نہ ہو، میں اُردو میں اوّل آئی تھی۔ پتاجی نے مجھے جرمنی کا چھپا ہوا دیوانِ غالب انعام دیا۔ جب سوچتی ہوں تو اکثر روتی ہوں کہ الیف۔اے میں فرسٹ آکر بھی میں دیوانِ غالب سمجھ نہیں سکتی۔"

میں نے پمّی کو پہلے اس رنگ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بچپن میں اسے اُردو سے لگاؤ ضرور تھا لیکن صرف قصے کہانیوں اور چھوٹے چھوٹے رسالوں تک —— وہ کیوں اس قدر حزیں تھی؟ غالب کے شعروں کی طرح اُداس لیکن میٹھی میٹھی!

شام کو ہم سیر کرنے "دگن" میں گئے تو امر نے بتایا کہ "اب یہ علاقہ نسلوں سے بالکل صاف ہو چکا ہے۔ نسلے بہت بڑے ہوتے ہیں۔" اس نے ہوا میں گھونسا

گھما کر کہا "سب کو مارتے ہیں"
پمی نے اُسے جھڑکا "یہ بڑا آوارہ ہو گیا ہے۔ اسے ابا جان کے پاس لے جاؤ"
امّر نے گھبرا کر پوچھا "ابا جان کون؟"
"ہیں ایک" پمی ہنسی "ہم سب ان سے پٹ چکے ہیں۔ ایک دفعہ تم بھی ان کی مار کھاؤ گے تو ٹھیک ہو جاؤ گے اور ایسی بکواس نہیں کرو گے"
امر سہم گیا "کیا وُہ بھی مُسلے ہیں؟" ہم دونوں ہنس پڑے۔
میں پمی کو کونے والی بیری کے نیچے لے گیا اور اسے بتایا کہ جب ان کی تبدیلی لائل پور ہوئی تھی اور جس شام وُہ یہاں سے چلے گئے تھے اسی شام میں نے پمی کا نام اس بیری پر کھودا تھا۔ دیا سلائی جلا کر میں نے وُہ تنا اُسے دکھایا۔ لیکن زخم بھر چکا تھا اور اب وہاں نشان بھی نہ تھا۔ پمی کھسیانی ہنسی ہنسی اور اس بیری کی جڑ کھودنے لگی۔
"کیا کر رہی ہو؟" میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔
وُہ ہنسنے لگی "اسی دن میں نے تمھارے نام ایک خط لکھ کر یہاں دبایا تھا۔ اسے دیکھ رہی ہوں"
میرے دل میں غالب کا دیوان پھڑپھڑانے لگا "لیکن چھ سال بعد اب اُس کا کیا بچا ہو گا؟"
"بچا تو کچھ نہ ہو گا" اُس نے اپنا مُنہ اوپر اُٹھایا "پر اتنے عرصے کے بعد آج پھر ایک حماقت کرنے کو جی چاہتا ہے"
امّر ان باتوں کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ اُس کے ذہن پر شاید ابا جان کا بھوت مسلّط تھا۔ لیکن میرے دل و دماغ پر غالب کی وُہ ساری غزل لکھی جا رہی تھی ——
"مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہُوئے، جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
دعوتِ مژگاں کیے ہوئے، چاکِ گریباں کیے ہوئے، تصوّرِ جاناں کیے ہُوئے۔
نہیبِ طوفاں کیے ہوئے۔ . . . ." لیکن طوفان تو گذر چکا تھا اور میں تو گرے ہوئے بتوں کے انبار میں سے کچھ تنکے نکالنے کے کام پر مامُور تھا۔
رات کو امّر اپنی چارپائی میرے کمرے میں اُٹھا لایا۔ بہت دیر تک باتیں کرتا

رہا لیکن میں نے شاید ہی اس کی کسی بات کا جواب دیا ہو۔ پر جب وُہ ممّی کی کوئی بات کرتا تو میں غور سے سنتا اور شوق سے جواب دیتا۔ سونے سے پہلے اُس نے اپنی قمیص اُتار کر کہا "آپ کو ممّی جتنی اچھی لگتی ہے مجھے اتنی ہی بُری" اور پھر کروٹ بدل کر خاموش ہو گیا۔

دُوسرے دن صبح پتی نے امر کو جھنجوڑتے ہوئے میرے گال پر بھی ایک ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔ میں نے ویسے ہی آنکھیں بند کیے ہوئے جواب دیا "بھئی ہم تو جاگ رہے ہیں۔ یہ سزا کس جرم کی ہے"

"جاگ رہے ہیں تو اُٹھیئے نا" اُس نے میری ناک اُمیٹھی "جب بڑے ہی دن کے دس بجے تک سویا کریں گے تو چھوٹوں سے کوئی کیا کہے گا"

جب میں اُٹھ کر بیٹھ گیا تو اُس نے امر کی اُلٹی قمیص سیدھی کرتے ہوئے کہا "اِتنی چھوٹی ریاست سے اتنی بڑی تنخواہ پاتے ہو۔ کچُھ کام بھی کیا کرو۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی ہوئی فائیلوں کا پلندہ اُٹھا لیا اور بغیر کچھ بولے کاغذات اُلٹنے لگا۔ ممّی جو کچھ کہتی تھی اُس کا جواب دینے کی بجائے اس پر عمل کرنے میں لُطف آتا تھا۔

امر سکول چلا گیا تو وُہ نمک مرچ لگے کھیرے کی پھانکیں کھاتے ہوئے کمرے میں آئی۔ ایک پھانک مجھے دے کر کہا "اس میں فولاد ہوتا ہے۔ ہر روز نہار منہ کھانے سے آدمی ایسا ہو جاتا ہے" اُس نے اپنا عُنابی دوپٹہ دکھایا۔ میں پھانک کھانے لگا اور اُس نے کھونٹی سے میرا ہیبٹ اُٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ پھر آئینے میں دیکھ کر بولی "میں تم لگتی ہوں نا"

میں ہنسا تو اُس نے ہیبٹ ذرا ٹیڑھا کر کے کہا "اب تو لگتی ہوں نا۔ یہ دیکھو تمھارے ایسی ٹھوڑی اور یہ ٹھوڑی کا تل۔ ہُو بہُو تمھاری ناک ہے اور تمھاری چھوٹی چھوٹی آنکھیں —— اور یہ دیکھو۔ یہ تمھارے ماتھے کی لمبی لمبی سلوٹیں" پھر اُس نے اپنی لٹکتی ہوئی چوٹی کا گچھا بنا کر ٹوپ میں رکھ لیا اور بولی "اب"

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ وُہ کرسی پر ٹانگ رکھ کر بولی "تمھیں بجمہ سے محبت تھی"

میں بوکھلا گیا "محبت ؟ لیکن یہ تمھیں کہاں سے یاد آ گیا"

"ایسے ہی ــــ جب ہمارے اسکول میں ڈرامہ ہوا تھا تو مجھے ہیروئن بنی تھی ــــ بتاؤ نا تمھیں اس سے محبت تھی؟"

میں نے جواب دیا "نہیں!"

"لیکن اسے تو تھی"

"ہو گی ــــ کون ہے دُنیا میں جو یہ حماقت نہیں کرتا"

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ گھٹی ہوئی آواز میں اُس نے میرے ہی الفاظ دُہرائے۔

"ہاں، کون ہے دُنیا میں جو یہ حماقت نہیں کرتا"

"لیکن پچی" میں نے اس کا راستہ روک لیا "یہ حماقت کوئی بُری چیز تو نہیں"

"بھی ہو گا" اور وُہ چلی گئی۔ اتنے میں خداداد آ گیا۔ اُس نے بتایا کہ محمد دین ٹرک لے کر آ گیا ہے۔ وُہ ان دونوں لڑکیوں کو ہندوستان سے لے جائے گا۔ کیونکہ اب ان کا زیادہ دیر یہاں رہنا مناسب نہیں۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ لیکن تم محمد دین کو ابھی نہ جانے دو۔ کھانا دانا کھلاؤ اور ولگن میں گوندنی کے نیچے اس کی چارپائی ڈال دو۔ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ ذرا آرام تو کرے۔ کل صبح بھیج دینا"

خداداد چلا گیا اور میں بغلی غسل خانے میں جا کر کپڑے اتارنے لگا۔ پانی خوب ٹھنڈا تھا۔ دیر تک نہاتا رہا۔ رات کے باسی پانی نے جسم میں ایک نئی تازگی پھونک دی۔ ٹھنڈے دماغ نے پچی کے بُت سے برفانی مجسمے تراشے اور تصوّر کی آنکھ کو ترسانے لگا۔ جب میں نہا کر نکلا تو دونوں بازیافتہ لڑکیاں کوٹھڑی کی دہلیز سے لگی بیٹھی تھیں۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہیں پھٹی ہوئی تھیں اور وُہ اپنے آپ سے بھی پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں رحم بھری نظروں سے دیکھا نہ قہر آلودنگاہوں سے۔ یُونہی پاس سے گذرتے ہوئے وُہ میرے سامنے آ گئی تھیں۔

دوپہر کو میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ پچی برکیٹ صاف کر رہی تھی کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک رجسٹرڈ لفافہ لایا تھا۔ میں نے لفافہ ہاتھ میں پکڑ کر ادھر اُدھر دیکھا تو پچی نے فوراً اپنا ایورشاپ پن نکال کر مجھے دے دیا۔ میں نے دستخط کیے۔ لفافہ کھول کر پڑھا۔ ایک عرضی تھی، ٹائپ کے دو صفحوں پر مشتمل۔ کسی مغویہ لڑکی کی رُوداد جو اس کے والدین نے پاکستان سے لکھ کر بھیجی تھی۔ میں پہلی چند سطریں پڑھ کر ہی

سارا مضمون سمجھ گیا اور اسے تپائی پر رکھ کر پن سے کھیلنے لگا۔ نب میں ایک گہرا نشیب تھا۔ میں نے پمّی سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ایک دفعہ امّر نے اس میں تختی پر لکھنے والی روشنائی بھر دی تھی اور پمّی نے صفائی کے لیے رُومال میں نب لپیٹ کر بڑی مشکل سے دانتوں میں پکڑ کر پن سے باہر کھینچی تھی۔ جہاں رُومال کی تہ اکھڑی تھی وہاں دانت کا گہرا نشان پڑ گیا۔ یہ داستان سُنا کر پمّی ادھر اُدھر جھاڑن مارنے لگی۔ تپائی کی باری آئی تو عرضی جھٹکے سے نیچے گر گئی۔ میں نے اُٹھا کر پن سے اس کے حاشیہ پر ذرا بڑھا کر کے لکھ دیا۔ "بہت کوشش کی لیکن کوئی سُراغ نہیں ملا۔"

جب وُہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ قرینے سے رکھ چکی تو تپائی سے عرضی اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے دوران میں اُس نے مجھ سے انگریزی کے دو مشکل الفاظ کے معنی پُوچھے۔ جب پڑھ چکی تو کاغذ بڑھا کر کے میرا ریمارک پڑھا اور جھنجھلا کر عرضی کو میری گود میں پھینک دیا۔ "کتنے سنگ دل ہو تم؟"

میں نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دھند کا ایک ہلکا سا غبار چھا گیا تھا۔ دن بھر وُہ میرے کمرے میں نہ آئی۔ امّر بھی غائب رہا۔

مجھے سخت افسوس تھا کہ اس کو میرے سنگ دلانہ رویّے سے دُکھ پہنچا۔ ندامت بھی تھی۔ لیکن احساسِ ندامت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا خلا تھا جس میں ہر جذبہ ہر احساس آن کی آن میں کھو جاتا۔ میں کام کرتا تھا بالکل مشین کی طرح۔ سوچتا بھی مشین ہی کی طرح تھا۔ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔ . . . . اور بہت دیکھا تھا لیکن اس پر باوجود اس کے کہ میری اپنی آنکھوں نے دیکھا تھا، یقین نہیں آتا تھا۔ ٹرک چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے نہ چل رہے ہوں۔ مغویہ لڑکیاں برآمد کی جا رہی ہیں۔ شاید نہ کی جا رہی ہوں۔ پاکستان بن گیا ہے۔ کیا پتہ ہے نہ بنا ہو۔ میں ہوں اور پمّی پمّی . . . . ممکن ہے غلط ہو . . . . میں سنگ دل نہیں تھا۔ در اصل پتھریلا میں گھر کر پتھرا گیا تھا۔ میرا احساس، میرا تخیّل، میرا وجدان سب پتھرا گئے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اچانک میری اُنگلی میں کوئی چیز چُبھی۔ چونکا تو معلوم ہوا کہ عرضی پر سے اپنا لکھا ہوا ریمارک بلیڈ سے کھُرچ رہا تھا۔ اب کاغذ پر وُہ پتھر نہیں تھے۔ "بہت کوشش کی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔"

شام مٹیالی سے اندھیری ہو گئی۔ چمگادڑیں نکلی ہیں، ادھر اُدھر منڈلانے لگیں۔ ابھی چاند

طلوع نہیں ہوا تھا۔ خداداد، محمد خاں اور محمد دین چبوترے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے کبھی کبھار کوئی آدمی ان کے پاس سے گذرتا ہؤا صاحب سلام کہہ دیتا تو وُہ تینوں یک زبان ہو کر اس کا جواب دیتے۔ حقے کی گڑگڑاہٹ جھیل میں ڈوبتی ہوئی گاگردن کی طرح خوفناک آوازیں نکال رہی تھی۔ دونوں بازیافتہ لڑکیاں ابھی سوئی نہیں تھیں۔ لیکن ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ان کی شکستہ قسمت گہری نیند سو رہی تھی کسی نے آہستہ سے آکر میرا سر چھوُا۔ میں چونکا۔ پمی لبوں پر اُنگلی رکھے خاموش کھڑی تھی۔ مجھ پر جُھک کر بولی "آج میری مدد کرو۔ میں بڑی بپتا میں ہوں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

اس نے سنجیدگی سے کہا "مجھے ایک لڑکی کے اغوا کرنے میں مدد دے سکتے ہو؟"

"اغوا؟"

"شی شی" اُس نے میرے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ دی اور میز پر سے میرے کاغذات اُٹھا اُٹھا کر اٹیچی کیس میں ڈالنے لگی۔ بریکٹ سے کنگھی، تیل اور شیو کا سامان اُٹھا کر رکھا، کونے سے سلیپر اُٹھائے اور ان کو ٹھونسا۔ کھونٹی سے ٹائیاں اتار کر ایک کونے میں گھسیڑ دیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا تو مجھ سے مخاطب ہوئی "اور کچھ؟"

"اور تو کچھ نہیں۔"

"تو جلدی کرو۔ خداداد سے کہو، برتن سمیٹ کر ٹرک میں رکھے، لڑکیوں کو بٹھائے۔"

میں کچھ نہ سمجھ سکا "لیکن تم کیا کر رہی ہو؟"

"ذرا صبر کرو! ذرا صبر کرو!"

اٹیچی کیس اُٹھا کر وُہ باہر نکل گئی اور اسے محمد دین کے ہاتھوں میں دے کر بولی۔ "اسے لے جا کر ٹرک میں ڈال دو اور یہ سارے برتن بھی اور ان لڑکیوں کو بھی وہیں لے جاؤ۔"

محمد دین مجھ سے مخاطب ہؤا "کیوں صاحب؟"

میں صرف اس قدر کہہ سکا "ہاں ہاں۔"

محمد دین جانے لگا تو پمی نے مدھم آواز میں کہا "اور دیکھو ٹرک دلگن سے نکال کر گلی میں لے جانا۔" پھر خداداد اور محمد خاں سے مخاطب ہو کر بولی "جاؤ! تم بھی ٹرک میں جاؤ!" خداداد سٹ پٹایا ضرور لیکن بڑبڑایا نہیں۔

جب ہم اصطبل کے پہلو سے گذرنے والی اندھیری گلی میں جارہے تھے تو پمی نے کہنا شروع کیا "سجن سنگھ بہت بُرا آدمی ہے۔ میں نے عرضی میں آج اس کا نام پڑھ کر ہی حُسنا کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ گو وُہ پتاجی کا دوست ہے اور میں اُسے چاچا کہتی ہوں پر وُہ چاچا کہلانے کا مستحق نہیں —— کاش تم نے حُسنا کے باپ کی عرضی شروع سے آخر تک پڑھی ہوتی۔"

"میں بہت نادم ہوں، پمی۔ مجھے معاف کر دو۔ دراصل . . . . "اور میں اُسے ساری ٹریجڈی کا نقشہ کھینچ کر اپنے دل کی حالت بیان کرنے ہی والا تھا کہ اُس نے جلدی سے کہا "ہاں ہاں! میں معاف کر دُوں گی۔ ضرور معاف کر دوں گی۔" ایک دم اس کی آنکھیں اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکیں اور اُس نے گھبرا کر کہا "ذرا تیز قدم اُٹھاؤ۔ چاند نکلنے ہی والا ہے۔"

مجھے سجن سنگھ کے مکان کے پچھواڑے کھڑا کر کے وُہ اندر چلی گئی اور دس پندرہ منٹ تک وہاں باتیں کرتی رہی۔ کبھی کبھی مجھے اس کے مصنوعی قہقہے سُنائی دیتے جس میں سجن سنگھ اور اس کی بیوی کی کھلی کھلی ہنسی بھی شامل ہوتی۔ جب وُہ باہر نکلی تو اُس کی سانس پھُولی ہوئی تھی۔ وُہ جو کچھ کہتی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بے چین ہرنی کی طرح وُہ کبھی ادھر جاتی اور کبھی اُدھر۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے مجھے دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ میں نے تعمیلِ حکم کی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور ڈگمگاتی ہوئی ٹانگوں سے وُہ میرے کندھوں پر چڑھ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کے بوجھ سے شانوں پر لگے ہوئے سٹار میرے جسم میں کھُب گئے۔ زخم خوردہ ٹھوڑی میں نے اس کی گُندھی ہوئی چپل کے ریشمی پھُول پر رکھ دی۔ ایک ہی علاج تھا۔ جب وُہ اُترنے لگی تو پیچھے کو ڈول گئی۔ توازن قائم رکھنے کے لیے اُس نے میرے بالوں کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب وُہ اتر چکی تو چھت سے ایک اور ٹانگ لٹکی۔ حسنا اتر رہی تھی۔ چوروں کی طرح قدم اُٹھاتے ہم ٹرک تک پہنچے۔ محمد خان تختہ گرائے کھڑا تھا۔ جب حُسنا بیٹھ گئی تو پمی نے خداداد اور محمد خان سے کہا۔

"اپنی سٹین گن میں میگزین چڑھا لو۔ سجن سنگھ بہت کڑا آدمی ہے۔"

"لیکن تم . . . . . تم پمی . . . . . "میرا گلا رُندھ گیا۔

"ہاں ہیں —— تم میری فکر نہ کرو۔ اب یہاں سے چل دو۔ دیکھو چاند نکل آیا ہے۔"
اور ہم چل پڑے۔

حُسنا خاموش تھی۔ لیکن اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ پمّی خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں نے اُن کی طرف غور سے دیکھا۔ کتنی اداس چمک تھی۔ بالکل غالب کے شعروں جیسی۔ دونوں بازیافتہ لڑکیاں بھی خاموش تھیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وُہ سامنے نیم تاریک سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں جس کو ٹرک چاٹتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔

خداداد اور محمد خاں خدا معلوم کیا سوچ رہے تھے۔ پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی پھیل رہی تھی۔ پمّی میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے جانے اس سے کیوں پوچھا "پاکستان سے تمھارے لیے کیا بھیجوں، پمّی ؟"

پھر جانے خود ہی کیوں کہا "تمھارے مطلب کی چیز وہاں کیا ہو گی ؟"

"کیوں نہیں" پمّی کے لہجے میں کامل وثوق تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غالب کے دو اُس شعر چمکے "مجھے پھُولوں سے بہت پیار ہے۔ میں ان پر جان دیتی ہوں۔ ہو سکے تو وہاں سے"—— حُسنا اور دو بازیافتہ لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے" ایسے پھُول بھیجتے رہنا۔ میں تمھیں بہت یاد کیا کروں گی —— اور —— اور —— اچھا اب تم جاؤ۔ دیکھو کتنی روشنی پھیل گئی ہے۔"

جہاں پمّی کو اُترنا تھا۔ وہاں ٹرک رُکا۔ پمّی نیچے اتری۔ حُسنا کی طرف دیکھ کر مُسکرائی۔ میں نے ہونے سے کہا "پمّی" وُہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میری آنکھیں دُھندلا گئیں۔ پھیکی پھیکی سوگوار چاندنی میں اُس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ پھر اُس کے ہونٹوں میں جُنبش پیدا ہُوئی "الوداع ——"

میرا سارا وجود دکھو کھلا ہو گیا "الوداع، پمّی"

وُہ مسکرائی "مجھے غالب کا دیوان انعام میں ملا لیکن افسوس کہ میں غالب کو سمجھ نہ سکی۔ . . . . ایک شعر ہے اس کا . . . . موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے . . . . جانے کیا مطلب ہے اس کا" اور یہ کہہ کر وُہ چلی گئی۔ ایک بار بھی اُس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ انجن سٹارٹ ہُوا اور ٹرک سڑک کے پتھروں پر رینگنے لگا۔

مسکن

یہاں پہنچ کر یہ پگڈنڈی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے دونوں کناروں پر کھجور کے نوعمر درخت اور ببول کے خاردار پیڑ بھی۔ اب کریر اور ڈیلیا کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اِدھر اُدھر سر جھکائے کھڑی ہیں۔ میں اس چبوترے پر بیٹھا گاؤں کے تنوروں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کے مرغولوں کو دیکھ رہا ہوں جن میں بہت سی جانی پہچانی صورتیں گھوم رہی ہیں۔ سامنے نیم کے کسیلے اور بکائن کے بکسیلے درختوں تلے وُہ بوڑھا حقّہ پی رہا ہے جس کی آنکھوں میں اب شاید پہلی سی چمک نہیں رہی اس کی جھونپڑی سے اب بھی ہی دھواں نکل رہا ہے جو حیات کا سہارا اور زندگی کا آسرا ہے۔ اس کے بچے ایک پمپ چلا کر پیتل کی ایک گاگر بھر رہے ہیں۔ پتہ نہیں آگ اور پانی کا یہ کھیل کب سے شروع ہوا اور کب تک جاری رہے گا۔ تم نے ایک بار بتایا تھا کہ تمھیں بچپن ہی سے پانی کے کھیل بہت پسند تھے اور تم سردیوں کی یخ بستہ اور تاریک راتوں کو موم بتی جلا کر گڑیوں کے فراک بڑے شوق سے دھویا کرتی تھیں۔ اسی شوق میں بارش میں تمھیں نمونیا ہو گیا تھا۔ بڑا مہلک قسم کا نمونیا۔ اگر اس وقت تمھیں کچھ ہو جاتا تو میری زندگی کس قدر خالی ہوتی۔ بے جان گڑیوں کی آرائش کی خاطر اگر ایک جان چلی جاتی تو اور کسی کو شاید پتہ نہ چلتا لیکن مجھے ضرور محسوس ہوتا۔ اچھا ہی ہوا تم زندہ رہیں اور مجھ سے آملیں۔ اس کے بعد گڑیوں سے کھیلنے کا دور تو ختم ہوا پر ٹھنڈے پانی میں جھاگ بنا کر مُنہ ہاتھ دھونے کا شغل جاری رہا۔ کاش تم یہ کھیل ابھی اور جاری رکھتیں۔ اس کے ساتھ تمھیں سردیوں کی پیداوار، نرگس کے پھولوں سے کتنا پیار تھا۔ ایک دن جب تم آپی کے کمرے میں گلدانوں میں پڑے ہوئے نرگس کے پھولوں کو نئی ترتیب دے رہی تھیں تو تم نے پتہ نہیں ہر پھول کو کتنی مرتبہ چوما تھا اور جب میں دہلیز پر آکر کھڑا ہو گیا تو تم نے اپنا سویٹر نیچے کھینچ کر کتنی حسرت سے کہا تھا "ہائے یہ پھول اگر بٹن ہوتے تو میں

انھیں اپنے بسنتی سویٹر میں ٹانگ لیتی :- اس پر میں سوچنے لگا تھا کہ نرگس کے یہ پھول کس طرح سخت ہو سکتے ہیں ——— میں اب بھی اس بیگ میں یہ پھول لایا ہوں پر یہ تو اب بھی وہی مُرجھانے والے پھول ہیں، ٹانکنے والے بٹن نہیں اور اگر یہ بٹن بھی ہوتے تو مجھے اس وادی میں تمھارے مسکن کا نشان معلوم نہیں۔ لیکن اگر میں ان پھولوں کو اسی طرح اپنے ساتھ واپس لے گیا تو تم شاید ناراض ہو جاؤ گی جیسے اپنی سالگرہ کی آخری تقریب پر میں تم سے رُوٹھ گیا تھا۔ وہ دن کس قدر سوگوار تھا!

میری سالگرہ کی آخری تقریب جسے میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر بڑی دھوم دھام سے منایا تھا کس قدر سوگوار تھی جب تم نے مجھے کوئی تحفہ نہ دیا۔ گو میں جانتا تھا تم نہ آسکو گی، تم مجبور ہو۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ تم ایک بار آجاتیں، صرف ایک بار اور پھر پلک جھپکنے میں لَوٹ جاتیں۔ لیکن مجبوریاں پلک بھی تو جھپکنے نہیں دیتیں۔ دوسرے دن تم مجھے سکول جاتے ہوئے راستے میں ملیں۔ لیکن میں نے تمھیں بُلایا نہیں۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اب ساری عمر تم سے نہیں بولوں گا اور شاید میری ضدی طبیعت اس عہد کو پورا بھی کر لیتی اگر شام کو بُرش کرنے کے دوران میں میرے سیاہ کوٹ کا کالر نہ اُلٹ جاتا جہاں ریشم کے زرد تاگوں سے ایک ننھا سا نرگس کا پھول کڑھا ہوا تھا جس کے نیچے تمھارے نام کا پہلا حرف بھی کشیدہ کیا ہوا تھا۔ وہ پھول تو شاید اس قدر خوبصورت نہ ہوتا جس قدر حسین اس کا سہارا تھا مجھے سالگرہ کا اس سے بہتر کوئی تحفہ نہ ملا تھا اور نہ آئندہ توقع تھی۔ اس لیے وہ آخری تقریب بن کر رہ گئی۔ آج تک سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ تمھیں کشیدہ کاری کا وقت کیسے ملا؟ تم ہمارے یہاں آتیں بھی تو فوراً اُلٹے پاؤں واپس چلی جاتیں اور پھر تمھارا پھیرا کوئی روز روز ہوتا تھا! یاد ہے، ایک دن جب میں نے تمھیں کہا "ہر روز ہمارے یہاں آیا کرو" تو جواب ملا تھا "یہ کیونکر ہو سکتا ہے"! پھر میں نے کہا تھا "اچھا، ایک دن چھوڑ کر سہی" تو تم نے اس پر بھی مجبوری ظاہر کی۔ پھر میں نے کہا "وعدہ کرو کہ ——— لیکن تم نے بات کاٹ کر کہا تھا کہ "میں وعدہ کیسے کروں"۔

اس پر میں نے اتنا بھی تو کہہ دیا تھا کہ "بہتر ہوا گر تم اس دنیا میں ہی نہ رہو تاکہ میں آزادی سے تمھاری قبر پر آسکا کروں اور وہاں تم سے وہ ساری باتیں کہہ سکوں جو

اب تک تم سے نہ کہہ سکا۔ تمھارے پہلو میں اتنی دیر بیٹھ سکوں جس کی تمنا ہر لمحہ جوان ہوتی جا رہی ہے ———" لیکن تم نے کہا تھا " ایسے نہ کہو۔ مجھے موت سے ڈر لگتا ہے۔ میں زندگی کی عزت کرتی ہوں۔ مجھے زمانہ کے بڑے سے بڑے مصائب موت کے سامنے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ موت یقینی سہی۔ لیکن اس کی آمد سے پہلے اس کا نام میرے دل پہ ہول طاری کر دیتا ہے۔ نہ! نہ! مجھے ڈراؤ نہیں" پر میں تو اس کے متعلق ہی سوچتا رہا اور اس حسین خواب کی آرزو قوی تر ہوتی رہی۔ کاش یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا۔

وُہ دن بھی یاد ہو گا جب میں امتحان دینے لاہور جا رہا تھا اور تم بہانے بہانے مجھے الوداع کہنے آئی تھیں۔ میں نے پوچھا تھا " وہاں سے تمھارے لیے کیا لاؤں؟" تو جواب ملا تھا " اوّل پاس ہو کر لوٹیے۔ یہ تحفہ یادگار رہے گا" میں واپس آیا تو تم مجھ سے پرچوں کے بارے ہی میں پوچھتی رہیں اور کسی چیز کا ذکر نہ کیا۔ میں نے اپنا ہی بیگ کھول کر تمھیں سیاہ رنگ کا ابریشمی "ہیئر نٹ" اور ونیس کی رنگ برنگی پنسلوں کا ایک ڈبہ دیا۔ ایک بار تم نے کہا تھا نا نٹ بال کھیلتے ہوئے تمھارے بال بےحد پریشان ہو جایا کرتے ہیں اور پنسلوں کا ڈبہ؟ وہ تو میں یُونہی لے آیا تھا۔ تم نے پوچھا تھا۔ " ان سے کِس کی تصویر بناؤں؟" میں نے جواب دیا " اُس کی جس کا یہ ہیئر نٹ ہے۔" تو تم نے کہا تھا " اس کی نہیں جو یہ نٹ لایا ہے؟"

یُوں تو دنیا میں ایسے ہوتا ہی آیا ہے۔ مگر تم سے اس طرح آنکھیں پھیر لینے کی ہرگز توقع نہ تھی۔ میں اس ویران وادی میں اب بھی تمھارا انتظار کر رہا ہوں مگر تمھیں شاید معلوم نہیں اور اگر تمھیں معلوم بھی ہو جائے تو پھر بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ اب تم پہلے سے بھی زیادہ مجبور کر دی گئی ہو۔ پر تم اپنے اس طرح معذور ہو جانے کی اطلاع تو بھیج سکتی تھیں۔ تمھاری اس دل نواز محبت کو کیا ہوا؟ اگر تم اس وقت سے پہلے مجھے لکھ بھیجتیں تو کیا ہم کوئی تدبیر نہ لڑا سکتے؟ تم نے مجھے اس قدر کمزور کیونکر سمجھا؟ کیا مجھ میں نبرد آزمائی کی قوت نہیں؟ کیا میرے کندھوں پر ایک شاطر کا سر نہیں؟ اور فرض کرو۔ ہم کو چل دینا نہیں آتا تو کیا ہم خوشامد کے بھی اہل نہ تھے؟ گاؤں سے اب ہولے ہولے ڈھول بجنے کی آواز آ رہی ہے۔ ابھی اس پر زور سے ڈنکا پڑے گا اور پھر اس کے گرد گاؤں کے سارے جوان جھومر ڈال کر ناچنے اور گانے لگیں گے۔

روگاں دی ماری جندڑی علیل اے
سوہنا نہیں سُن دا ساڈی اپیل اے

. . . . . اور میں اس چبُوترے پر جس کی آدھی سے زیادہ اینٹیں اُکھڑ چکی ہیں بیٹھا ہوا ہوں۔ میری نہ تو جندڑی علیل ہے اور نہ مجھے اپیل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ نیم اور بکائین کے جھُنڈ تلے وُہ بوڑھا اب بھی اپنے حقّے سے سرگوشیاں کر رہا ہے لیکن اس کے جھونپڑے سے دُھواں نکلنا بند ہو گیا ہے۔ اُسے کسی کا انتظار نہیں۔ لیکن اس کی نشست اس انداز کی ہے کہ کسی کی راہ دیکھ رہا ہے۔ ایسے ہی ایک رات میں اپنے کمرے کے لیمپ کی مدھم روشنی میں تمہارا انتظار کرتا رہا۔ میز کے کنارے پر شاید میں اسی طرح بیٹھا تھا جیسے اب اس چبوترے پر بیٹھا ہوں۔ اس وقت میرے سامنے کھُلی ہوئی کتابیں تھیں اور اب یہ کھُلا ہوا بیگ ہے۔ تم بھائی جان اور آپی کے ساتھ سرکس دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ مجھے پتا تھا آدھی رات کو تمہارا دروازہ کھولنے کوئی نہیں اُٹھے گا اور اگر میں بھی سو جاتا تو تمھیں کس قدر تکلیف ہوتی۔ لیکن میں سوتا کیوں؟ مجھے معلوم تھا کہ جب تم میرے کمرے میں گذرو گی تو سب سے پیچھے رہو گی۔ آپی اور بھائی جان کی موجودگی میں مجھ سے بات تو نہ ہو سکے گی۔ لیکن جاتے جاتے اپنی مخروطی اُنگلی سے میری گرم گرم گردن پر نشان بنا جاؤ گی۔ مجھے ایک پھریری سی آئے گی اور جب تم چلی جاؤ گی تو میں اپنے کالر کے نیچے اس برفیلی مچھلی سے کھیلنے کے لیے بار بار جھنجھنا اُٹھوں گا اور پھر یہ رات اُسی روح سے بازی کرنے میں گذر جائے گی ——— لیکن اب تو مجھے اس مخروطی اُنگلی کے مس کی تمنا نہیں، اب تو مجھے اس برفیلی قاش کے تڑپنے کی اُمید نہیں۔ پھر میں اس چبُوترے پر اُسی انداز میں کیوں بیٹھا ہُوں؟ شاید اچانک اُسی طرح جس طرح پچھلے ہفتہ دس روپے کا وُہ نوٹ جو پھر پھرا کر میرے ہاتھ آ گیا جس کے ایک کونے پر میں نے تمھارے نام کے ہندسے لکھے تھے تم بھی آ جاؤ مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میری اس عادت پر کس قدر برہم ہوئی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ تم نے کہا تھا "آپ دولت پر میرا نام لکھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔ کیونکہ آپ امیر ہیں۔ میں سرمائے کی پجارن نہیں۔ جذبات کے مکتب کی پروردہ ہوں۔ ہمارے رابطے کو اتنا سستا تو نہ بنایئے" اور جب میں یہ بات سُن کر ذرا پشیمان ہو گیا تھا تو تمھی نے میری خفت مٹانے کے لیے کتنے پیار

سے کہا تھا "مجھے پتہ ہے آپ کا انوکھا اندازِ فکر کبھی آپ کو ایک افسانہ نگار بنا دے گا۔ اس وقت آپ کی کسی کتاب پر میرے نام کے ہندسوں کے بجائے اگر میرا نام لکھا ہو گا تو مجھے کتنی خوشی ہو گی" ـــــــ لیکن میں افسانہ نگار نہ بن سکا اور تمہارے نام سے کسی کہانی کو نسبت نہ دی جا سکی اور اب تو وُہ نوٹ بھی معدُوم ہو چکے ہیں جن پر تمہارے نام کے ہندسے لکھے تھے۔ اس وقت نہ تم جذبات کے مکتب کی پروردہ ہو اور نہ میں اقتصادیات کا طالب علم۔ میں تو ایک مُسافر ہوں جو تھوڑی دیر کے لیے یہاں آیا ہُوں اور اس چبوترے پر بیٹھ کر جھومر ڈال کر گانے والے گبھروؤں کی ہنکاریں اور ڈولی میں سوار کراتی ہوئی ہمجولیوں کے درد بھرے گیت سُن رہا ہوں۔

میں پوچھتا ہوں، تم نے اتنے سارے وعدے جو کیے تھے وُہ کیا ہُوئے؟ وُہ لمبے لمبے پروگرام جو ہر روز مرتب ہوتے تھے اب کس طرح پُورے ہو سکیں گے۔ اگر اسی طرح کرنا تھا تو مجھے پہلے بتا دیا ہوتا۔ میرے پاس تمہاری کوئی بھی نشانی نہیں اور میں صرف تمہاری یادوں کے سہارے اتنی لمبی عمر بسر نہیں کر سکتا۔ تمہاری یاد تازہ کرنے کے لیے بھی تو کسی آسرے کی ضرورت ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں تم میرے دماغ سے محو ہی نہ ہو جاؤ۔ غمِ روزگار بہت ہی دل فریب ہے ہم تقسیمِ ملک کے بعد جو آج تک نہ مل سکے۔ اس میں سراسر میرا قصور ہی تو تھا۔ میں آج تک اپنی زندگی برقرار رکھنے میں کوشاں رہا۔ اس دوران میں تمہاری یاد میرے ذہن سے بار بار آ کر ٹکراتی تو رہی مگر ایسے جیسے بارش کا کوئی چھینٹا کسی دیوار سے جا ٹکراتا ہے۔ تمہارا چہرہ تخیل کی وادی میں لہرایا ضرور مگر میری بے پناہ غیر ضروری مصروفیتیں اس کے درمیان اندھا شیشہ بن بن گئیں۔ یہی نہیں بعض اوقات میرا دل یُوں بھی چاہا کہ میں اپنے دوستوں کی طرح کسی کے ساتھ سینما دیکھنے جاؤں، تحفے دُوں اور ان سے نشانیاں وصول کروں۔ پیتل کی وُہ انگوٹھی جو میں نے تم سے بڑی خوشامدوں کے بعد حاصل کی تھی تھوڑا عرصہ ہُوا ستلج میں کشتیاں دوڑاتے ہوئے گر گئی۔ میرا محبوب سیاہ کوٹ مشرقی پنجاب میں ہے۔ تمہارے نام کے ہندسوں والے نوٹ اب بند ہو گئے ہیں اور ستلج کا وُہ حصّہ بھی ہمارے ملک میں نہیں رہا۔

جس دن تمہارا کنبہ ہمارے قصبہ کو چھوڑ کر جا رہا تھا اس دن مجھے پریشان دیکھ کر

تھی نے کہا تھا کہ "کوئی بات نہیں ایک ہی زمین پر ہیں۔" لیکن چند سالوں کی بات ہے ایک دن جب میں شہر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو تم نے مضطرب ہو کر پوچھا تھا۔ "ہمارے قصبے میں کالج نہیں کھل سکتا کیا؟" "کیوں"۔ میں نے پوچھا تھا تو تم نے جواب دیا کہ "ایک ہی بستی میں خواہ دُور دُور رہیں پر ملنا آسان ہوتا ہے۔" اب تم ہی سے پوچھتا ہوں کہ میں کہاں بیٹھا ہوں؟ کیا یہ ایک ہی بستی نہیں؟ کیا یہ ایک ہی زمین نہیں؟ اب کہو ملنا آسان ہے! گو ہم اتنا عرصہ دُور دُور رہے لیکن اس دوری کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ تم کوئی اور آغوش اختیار کرتیں۔ میں تو ہر گھڑی یہی سمجھتا رہا کہ اب بھی تمھیں اسی شدّت سے یاد ہوں لیکن تم نے شاید ایسا نہیں جانا۔ اگر ایسا سمجھتیں تو اس طرح دھوکا نہ دیتیں۔

مشرقی پنجاب چھوڑنے کے بعد مجھے مدّت تک تمھارے اقامت پذیر ہونے کا پتہ نہ چلا اور نہ ہی میں تجسس کر کے معلوم کر سکا۔ ان دنوں اپنی زندگی غیر معمولی طور پر پیاری ہو گئی تھی۔ تمھارا صرف اتنا پتہ تھا کہ تم زندہ ہو اور کہیں آباد ہو۔ اسی ملک میں اسی زمین پر پنجاب کے کسی گوشہ میں۔ پرسوں اچانک تمھارے بھائی اسٹیشن پر مل گئے۔ وہ راولپنڈی اپنی نوکری پر واپس جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے تمھارے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ چونکہ انھیں چار دن سے زیادہ چھٹی نہ مل سکی تھی اس لیے وہ جلد واپس جا رہے تھے۔ اُنھیں کی زبانی معلوم ہوا کہ اگلے روز تمھارا سارا کنبہ اُن کے پاس راولپنڈی چلا جائے گا کیونکہ تمھیں رخصت کرنے کے بعد تمھارے ابّا اور امّی اس گاؤں میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ آج میں یہاں بیٹھا ہوا یہی سوچ رہا ہوں کہ آج اور کل میں کتنا فرق ہے۔ کتنا بُعد ہے۔ کس قدر دُوری۔ آج گاؤں میں مسرّت کے شادیانے بج رہے ہیں۔ کل خدا معلوم کیا ہو۔ آج تنوروں سے دُھواں اس لیے اُٹھ رہا ہے کہ زندگی کی حرارت برقرار ہے۔ کل شاید یہی دھواں اسی حرارت کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بل کھانے لگے۔ آج یہ بوڑھا اس لیے انتظار کی گھڑیاں گِن رہا ہے کہ قالبِ انسانی کی تذلیل نہ ہو۔ اور کل، آنے والی کل! پتہ نہیں کس وقت آئے اور کیسے آئے! یہاں پہنچ کر یہ پگڈنڈی ختم ہو جاتی ہے۔ ببول کے درخت خاموش ہیں۔ ڈیلیا میں موٹے موٹے خوناب پروئے ہوئے ہیں۔ یہ چبوترہ پہلے ایسا نہ ہو گا۔ اسے چننے والوں نے سیمنٹ اور ریت کو اپنے آنسوؤں سے گوندھا ہو گا۔ اس کی سطح پر

اپنی پلکوں سے جھاڑ دی ہوگی اور یہاں اپنی سانسوں کے چراغ جلائے ہوں گے لیکن اب یہ بالکل اُکھڑ چکا ہے۔ اس کے پہلوؤں میں چیونٹیوں نے بل بنا لیے ہیں اور مسلسل بارشوں نے اس کی تنویروں کو بھلا دیا ہے۔ میں نے کہا نا کہ غمِ روزگار واقعی بہت دلفریب ہے۔ میں بھی یہاں پہلی اور شاید آخری مرتبہ آیا ہوں کشمکشِ حیات بار بار رخصت نہیں دیتی۔ یہ تمہارا گاؤں ہے۔ یہ تمہارا قصبہ ہے۔ یہی تمہارا شہر ہے لیکن میں اس کے ایک کونے پر تمہارے مسکن سے بالکل بے خبر بیٹھا ہوں۔ میرا یہاں کوئی بھی واقف نہیں۔ سوائے تمہارے، اور تم انجان بنی بیٹھی ہو۔ صرف یہ شادیوں کے ترانے مانوس معلوم ہوتے ہیں۔ جو ہر شادی پر بجا کرتے ہیں۔ شاید ان کی آواز تم بھی سُن رہی ہو۔ لیکن اب تم کچھ نہیں کر سکتی ہو میں بھی ان کے بول سمجھ رہا ہوں۔ پر اب مجبور ہوں۔ پہلے تمہاری بے رُخی سے شکوہ تھا۔ اب نہیں رہا۔ اب ہم دونوں ایک سے ہیں۔ مجھ سے اپنی یاد میں حشر کے دن نباہ کرنے کی توقع نہ رکھنا۔ میں تمہارے بعد اپنی زندگی بہلانے کے لیے طرح طرح کے کھلونے خریدتا پھرتا ہوں اور یہاں بھی اسی کی خوشنودی حاصل کرنے چلا آیا تھا۔ شاید اسی کو خوش کرنے کے لیے میں نے تم سے پیار کیا تھا۔ اب اسی کو مسرور کرنے کے لیے تمہاری بے التفاتی کا نظارہ کرنے آیا ہوں۔ ابھی ابھی اس بوڑھے کی بیوی پیتل کی گاگر پانی سے بھر کر لائی تھی۔ میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی اور بیگ کو دیکھ کر بولی "کس قبر پر پانی چھڑکوں، مسافر؟" میں نے جواب دیا۔ "یہیں اسی جگہ، جہاں یہ پگڈنڈی ختم ہو جاتی ہے، جہاں سے ڈیلیا اور کریر کی جھاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں۔" وُہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی اور میں نے جیب سے چونی نکال کر کہا۔ "ہاں ہاں! یہیں اسی جگہ انڈیل دو، اسی راہگذر پر۔ یہیں کہیں اسی وادی میں اس کا مدفن ہے۔" وُہ اسی راہ پر پانی انڈیل کر چلی گئی ہے۔ بہت سے چیونٹے جن کے گھروں میں پانی گھُس گیا تھا ادھر اُدھر بھاگے پھرتے ہیں۔ کتنے ہی ٹبلے جو پانی کی سطح پر تیرنے لگے تھے کانپ کانپ کر ٹوٹ گئے ہیں۔ وہ سوندھی سوندھی خوشبو جو مٹی اور پانی کی ہم آغوشی سے پیدا ہوئی تھی اب مٹ چکی ہے۔ پانی جذب ہوتا جا رہا ہے۔ یہ کھیل بھی ختم ہوا۔

اچھا اب چلتا ہوں۔ یہ رات بہت لمبی ہے۔ یہ سفر بہت لمبا ہے اور یہ زندگی تو بہت ہی لمبی ہے اور ہاں میں نرگس کے یہ چند پھول تمہارے لیے لایا تھا یعنی سویٹر کے زرد زرد بٹن۔ انھیں بھی اسی سیلی زمین پر چھوڑے جاتا ہوں۔ یہ رات بہت

تاریک ہے۔ یہ گاؤں میرے لیے اجنبی ہے۔ آج رات کُہر کے آثار نمایاں ہیں اور مجھے بہت دُور کا سفر درپیش ہے۔ اچّھا! — اچّھا!

شب خون

"ہائے اللہ! شفقو بھائی مر جائیں گے تو کیا ہو گا!" منی نے اپنے سینڈل کا تسمہ کھولتے ہوئے کہا۔ وہ جلا دینے والی گرمی میں سکول سے پیدل ہی آئی تھی اور پسینہ میں نہا رہی تھی۔ منہ سے لمبی لمبی پھونکیں چھوڑ کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر اچانک اُسے شفقو بھائی یاد آ گئے۔ ہائی جین کی کتاب میں لکھا تھا کہ گرمی دِق کے مریضوں کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ پتہ نہیں اب بیچارے شفقو بھائی کس حالت میں ہوں گے۔ اُس نے ایک نظر اماّں جان کی طرف دیکھا جو اپنی سنہری فریم کی عینک کے پیچھے سے اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ غنودگی سے اُن کی آنکھیں بند ہو ہو جاتیں اور اخبار کو تھامے ہوئے ہاتھ ڈھیلے ہو کر منہ کی طرف لپکتے۔ اخبار سرسراتا اور وہ ایک دم آنکھیں کھول کر چوکس ہو جاتیں۔ اس جدوجہد میں انھوں نے منی کا فقرہ مشکل سے سُنا مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ شفقو کو وہ آج سے دو سال پہلے رو چکی تھیں اور اس کے لیے وہ اتنے آنسو بہا چکی تھیں کہ اب ان کی آنکھوں میں پانی نہ رہا تھا۔ جب وہ اکثر اپنی خاندانی غیر معمولی بصارت کا تذکرہ کرتیں تو شفقو کا ضرور ذکر آ جاتا جس نے انھیں عینک پہننے پر مجبور کر دیا تھا۔ شفقو کی بیماری نے انھیں کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ دُنیا کا نہ دین کا! چھ ماہ تک تو یہ بیماری ایسی چھپی رہی جیسے کسی نوجوان لڑکی کے سینے میں گمنام سی آہ مگر اس کے بعد ایک دم اُجاگر ہو گئی۔ پھیپھڑوں کی دھونکنی سے بوسیدہ کپڑوں کے پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں اور سانس کی نالی میں سڑے بسے بساندھ کے مارے حقے گڑگڑانے لگے۔ چچی جیناں نے دو تعویذ دیے۔ ایک تو مریض کے بازو سے باندھ دیا گیا اور دوسرے پر صبح صبح چٹاخ پٹاخ سات جوتے پڑتے اور پھر ریشم کی ایک تھیلی میں جہاں کافور اور مشک کے ذرّے مہکتے اور گوٹے اور ورق کی کرنیں جھلملاتیں ڈال دیا جاتا اور سب سے اونچی کھونٹی پر یوں لٹکا یا جاتا کہ کسی ذی رُوح کا سایہ نہ پڑے۔ چھپکلیاں تو خیر شہتیروں کے بیچوں بیچ چلتی ہیں۔ لیکن پھلواڑی سے آتی

ہُوئی تتلیاں اور شہد کی مکھیاں البتہ اس کے گرد منڈلا رہی تھیں لیکن ان کا سایہ نہیں ہوتا۔

"...... میں اپنے ابلق گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے کنوتیاں جوڑیں۔ شُشس شُشس کرتی دُم کو جھٹکا اور پچھلی ٹانگ زور سے جھاڑی۔ دور سانس کرتی ہُوئی لڑکی کو دیکھ کر اُس نے اپنے نتھنے پھُلائے اور ایسے ہنہنانے لگا جیسے ہارمونیم کے موٹے سروں پر پھسلتی ہوئی اُنگلیاں ڈگمگا رہی ہوں۔ میں اُسے زہریلے کانٹوں والی جھاڑیوں اور اُکھیلے سرکنڈوں پر سے پھلانگا کے گیا تھا اور دوڑاتا لایا تھا۔ اس کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان پیپن کا ایک چھتہ لٹک رہا تھا اور اگلی گامچیوں سے خون بہنے لگا تھا۔ گھوڑے نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور اگلی لگام جھٹک کر آزاد ہو جانے کی درخواست کی۔ شاید اس نے اپنی طرف بڑھتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر ایسے کیا تھا۔ میں نے اُس کی گردن تھپتھپائی اور میرا ہاتھ گرم پسینے اور سنہری سنہری لوئیں سے تر بتر ہو گیا۔ اس سے گھوڑے کی سخت جانی اور تنومندی کی بُو آتی تھی۔

"لائیے"۔ اُس لڑکی نے میرے قریب آکر کہا اور میں نے باگ اس کے ہاتھ میں دے دی۔ گھوڑے نے ایک قدم اُٹھایا۔ مگر وُہ لڑکی وہاں سے ہلی نہیں۔ یونہی کھڑی رہی، خاموش اور بے جان۔ اُس کی دھوئی دھائی بے نور آنکھوں میں نرگس کے مُرجھائے ہوئے پھُول سرنگوں تھے۔ سرمے کی موٹی موٹی تحریر باہر کے سیاہ حلقوں سے مل کر بہت بھیانک ہو گئی تھی۔ خون کی کمی سے چہرہ مچھلی کے گوشت کی طرح پھیکا سا دکھائی دیتا تھا اور مساموں سے زہریلے سوتے پھُوٹ رہے تھے۔ اس کی سانس گرم تھی مگر نانوس! چہرے پر پسینے کے قطرے تھے مگر ٹھنڈے اور بے مہک ہونٹ چھال کا رنگ پکڑنے سے عاری تھے۔ اور سفید منجھے ہوئے دانتوں میں زندگی کی ایک بھی کرن نہ تھی۔ اس کے بال جو کبھی بہت سیاہ ہوں گے بھُٹوں کے جھونٹوں کی طرح دھوئے ہوئے تھے۔ گہرے پیلے رنگ کی قمیص نے جس سے دیسی صابن کی بُو آرہی تھی اُسے زندگی کی لپیٹ سے بہت دُور کھینچ لیا تھا اور اب وُہ زندگی اور موت کے درمیان ایک بھیگی ہوئی بھڑ کی طرح سمٹی ہُوئی تھی۔ خاموش اور بے جان! میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے باگ چھوڑ دی اور لرزنے لگی۔ گھوڑا ٹاپیں مارتا دانے کی طرف لپکا اور وُہ ڈگمگا کر مجھُ سے لگ گئی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر مُنہ رکھ دیا۔ وُہ اتنے ٹھنڈے تھے کہ میں نے اپنے لبوں کو ہٹا لینا چاہا۔ مگر اس کی آنکھوں میں پھر پھڑاتی

ہوئی مجروح التجا کو دیکھ کر انھیں اُٹھایا نہیں بلکہ دبا دیا اور زور سے، اور شدت سے۔ ذرا سی دیر کو اُس کے لبوں میں حرارت پیدا ہوئی جیسے تھکتی ہوئی بیٹری کا بلب اُونگھتا ہوا آنکھ کھولتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ جاتی دفعہ اُس نے اپنے پپوٹے جھپکے مگر بجلی نہ چمکی۔ اُس نے اپنے انگ انگ کو جھلایا مگر مسکا نہ سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "نسیم نے شفقو کا یہ خط جیب میں رکھ لیا اور اپنے کمرے کو مقفل کر کے چابیوں کی زنجیر انگلی پر گھماتا ہوا باہر نکل گیا۔

بیٹرس نے گریبان سے پین نکالا اور چارٹ بھرنے لگی "رات کتنی مرتبہ خون تھوکا؟"

"یہی کوئی بیس پچیس دفعہ"

"پروگریسنگ!" اُس نے مسکرا کر نیلی شیشی کے منہ سے تھرمامیٹر نکالا اور شیشے کی صُراحی سے اُس پر پانی گرا کر ایک دفعہ جھٹکا۔ شفقو پہلے ہی سے منہ کھولے لیٹا تھا۔ تھرمامیٹر زبان سے چھوا اور اُس نے ہونٹ بند کر لیے۔ بیٹرس چارٹ پر کچھ دیر لکھتی رہی۔ پھر اُس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی منی سی گھڑی کو دیکھا اور تھرمامیٹر اُس کے منہ سے نکال کر پھر اسی نیلی شیشی میں ڈال دیا۔

"پروگریسنگ" اس نے ایک دفعہ پھر کہا اور چارٹ دیوار سے لٹکا دیا۔

"ہر روز پروگریسنگ" شفقو نے مسکرا کر کہا "بیٹرس تمھارے ایسا خوش فہم بھی شاید ہی کوئی ہو"

"خوش فہم" اُس نے حیرانی سے پوچھا "تم ترقی کر رہے ہو۔ یہ چارٹ دیکھو" اُس نے چارٹ اُتار کر کہا "یہ لائن کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ دیکھو! دیکھو!" بیٹرس نے چارٹ اُس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہا مگر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مسکرانے لگا۔

"تم بڑے شریر ہو" بیٹرس نے چارٹ کا کونہ اس کی ناک سے چھوا کر کہا اور پھر یہ کہہ کر کہ وہ بہت جلد اچھا ہو جائے گا آگے چلی گئی۔ یہ سُن کر شفقو مسکرانے لگا اور دیر تک مُسکراتا رہا۔

گرمیوں کی شدید گرم اور چاندنی راتوں میں خالد اکثر اپنی جرسی کے بٹن کھولے

مُونج کی نم دار چارپائی پر اُوندھے مُنہ لیٹ کر سوچنے لگتا کہ "اُپر چچا" مر جائیں گے تو اچھا ہوگا یا بُرا۔ چاچا نے اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر اتنا بڑا کیا تھا۔ اس کی پیدائش سے لے کر اپنی بیماری کے شروع ہونے تک وہ اس کے ساتھ یوں چمٹے رہے گویا یہ وابستگی ہمیشہ رہے گی۔ خالد کو اپنے چچا کا گول مول اور گھنی مونچھوں والا چہرہ یاد آگیا جس کے دائیں گال کی ہڈی پر ایک نشان تھا ــــــ گہرے زخم کا چاند سا نشان! خالد کا دل رونے کو چاہتا تھا مگر گرمی کی زیادتی اور کھلی ہوئی چاندنی کی بہار اُسے رونے نہ دیتی۔ اُپر چچا اُس کے لیے کتنے اچھے اچھے کھلونے لاتے تھے۔ چوں چوں کرنے والا مُرغ، سیٹی بجانے والا انجن اور سلام کرنے والا فوجی۔ پھر وہ ذرا بڑا ہوا تو نیلی پیلی رنگ برنگی تصویروں والی کتابیں لانے لگے۔ اُس کے ابّی کی آنکھ بچا کر میٹھی گولیاں اور آم پاپڑ بھی لا دیتے تھے۔ کتنے اچھے تھے چاچا جب کوئی اُسے مارتا تو وہ اُسے مُرغی کی طرح اپنی گود میں چھپا لیتے۔ بابا جی کہتے تھے، اِس طرح وہ خالد کی عادتیں بگاڑ دے گا۔ وہ ضدی اور چنچل ہوتا جاتا تھا اور ہر بات منوانے کے لیے زمین پر لیٹنے لگتا تھا اور ندیدوں کی طرح ہر کھانے والے کی طرف گھورتا رہتا تھا۔ خالد کو یہ الفاظ یاد آئے تو وہ بہت کھسیانا ہوا بچپن میں اس کا رویہ واقعی اس قسم کا تھا اور بڑے ہو کر بھی وہ بہت ممکن ہے ایسے ہی رہتا اگر اُپر چچا کو دق نہ ہو جاتی ــــــ اس لحاظ سے تو اُپر چاچا کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ یہ سوچ کر وہ ذرا سا کانپا اور پھر اپنی ٹانگیں ہلانے لگا۔ سردیوں کی وہ رات جب بادل اُمڈ گھمڈ کر آئے تھے اور شام ہی سے موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی اب خالد کو یاد آرہی تھی۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ بجلی کا مین فیوز اُڑ چکا تھا اور اب صرف انہی لکڑیوں کی نارنجی روشنی سامنے کی دیوار پر ققمُم کی طرح جگمگا رہی تھی۔ روشن دانوں کے شیشوں سے چھنتا ہوا بھیانک اندھیرا اندر جھانک رہا تھا۔ باہر زنبیل دیتی ہوئی ہوا اب چنگھاڑنے لگی تھی۔ اور دوسرے کونے میں ٹڈی خوف سے ٹرّائے جاتی تھی۔ خالد اُپر چاچا کے ساتھ بستر میں لیٹا ہوا تھا کہ انھیں اچانک ایک شرارت سوجھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور سانس روک کر کہنے لگے "لو بھئی خالد ہم تو مر گئے"

خالد رونے لگا پر وہ اسی طرح دم کشی کیے بیٹھے رہے۔ اس کی سسکیاں آہوں

اور پھر چیخوں میں بدل گئیں مگر وُہ نہیں مانے۔ جب وُہ رونے سے زندہ نہیں ہوئے تو خالد خاموش ہو گیا اور خود بھی یہ کہہ کر کہ "اُپر چچا ہم بھی مرتے ہیں۔" آنکھیں مُوند کر لیٹ گیا۔

"ایسے نہیں بکا کرتے۔" انھوں نے ایک دم آنکھیں کھول کر کہا۔

"تو آپ کیوں بکتے تھے؟"

"میں تو تمھارا چچا ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ میں تو۔۔۔، میں تو۔۔۔ بڑوں کی نقل نہیں اُتارا کرتے، اچھا!" انھوں نے چمکار کر کہا۔ وُہ تو خیر جھوٹ مُوٹ کی بات تھی پر اب اُپر چچا واقعی مر رہے تھے اور انھیں کوئی رونے والا نہ تھا۔ خالد نے کروٹ بدلی اور اپنے ابّی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ابّی! ابّی!" اس نے ہولے سے کہا "سو گئے ابّی؟"

"نہیں!" اس کے ابّی نے غنودگی میں جواب دیا "کیوں کیا بات ہے؟"

"ابّی میں کل ہاسپٹل جاؤں گا۔ اُپر چچا سے ملنے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا

"پاگل ہوا ہے!" اُس کے ابّی نے جھڑک کر کہا "اس سے تو بہتر ہے کہ کچھ کھا کے سو رہ۔"

"کیوں ابّی؟" خالد نے بسور کر پُوچھا۔

"ارے اُلّو۔ کوئی صحت مند ٹی بی کے وارڈ میں بھی جاتا ہے؟"

"جاتے تو ہیں، ڈاکٹر لوگ جاتے ہیں۔ دوا پلانے والی نرسیں ہوتی ہیں بھنگی اور سقّے ——"

"وُہ تو ان کا فرض ہے کہ۔۔۔۔"

"اور فرض کرو ابّی یہ میرا بھی فرض ہے کہ۔۔۔۔"

"گدھا کہیں کا —— فرض کیا کیا؟ یہ بھی کوئی الجبرے کا سوال ہے!"

"پر ابّی۔"

"ضد نہیں کیا کرتے بیٹے۔ اپنے چچا کی صحت کے لیے یہیں سے دُعا کر دو۔"

"کیا دُعا کروں ابّی؟"

"یہی کہ خُدا اُن کے دن آرام سے بِتا دے۔"

"اور خُدا انھیں صحت دے۔"

"ہاں یہ بھی . . . . . مگر"

"مگر کیا امّی ؟"

"لیکن اس بیماری میں صحت نہیں ہوتی"

"لیکن اگر اللہ میاں چاہیں تو ؟"

"ہاں پھر تو ہو سکتی ہے مگر اللہ میاں چاہتے نہیں"

"چاہتے کیوں نہیں امّی ؟"

"سو رہو!"

"امّی ، اللہ میاں . . . . .!"

"سو رہو!"

"امّی جی ، اللہ میاں جی"

"سو رہو!"

خالد خاموش ہو گیا مگر سویا نہیں۔

"تمھارے نتھنے بڑے خوبصورت ہیں" بیٹرس نے شفقو کی ناک چھو کر کہا۔

"ہاں اچھے تھے پر اب نہیں"

"اب کیوں نہیں —— دیکھو جب تم سانس لیتے ہو تو یہ نوزائیدہ بچّے کی ہتھیلیوں کی طرح گلابی ہو جاتے ہیں"

"مگر تمھارے جیسی خوبصورت ناک میں نے کسی اور کی نہیں دیکھی —— یہ رومن نوز ہے؟" شفقو نے سوال کیا۔

"ہاں" بیٹرس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر مسکرا کر نیچے دیکھنے لگی۔

"تمھارے بازو کس قدر خوبصورت اور مضبوط ہیں۔ یہ آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی خونبار شریانیں۔ میرا دل چاہتا ہے ان سے خون چوس لوں"

"چوس لو" بیٹرس نے بازو آگے بڑھا کر کہا۔

"نہیں ایسے نہیں۔ کسی دن چھاپہ ماروں گا"

بیٹرس ہنسنے لگی۔ شفقو نے اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھ دیا اور بولا "تم نے یہ تازگی کہاں سے پائی؟ یہ زندگی، یہ شباب اور اتنی رعنائی۔ تم نے کبھی الفانسو کھایا

ہے ؟ تمھارے ہونٹ اس کی قاشیں ہیں۔کاش میں نورا بھی تمھاری طرح اپنے ہونٹوں کو لپ اسٹک سے پاک رکھتیں ـــــ تمھاری سیاہ اور عمیق آنکھیں جو اندھیرے اجالے کے سانس لے رہی ہیں اور تمھارے بال گھنے اور . . . . . اور . . . . . لیکن میں نے تمھارے بالوں کو کبھی نہیں دیکھا۔تم سکارف پہنے آتی ہو اور ایسے ہی چلی جاتی ہو۔" بیٹرس نے رومال اپنے سر سے اُتار دیا اور اُس کے طلائی بال ایک دم کھُل پڑے "خوب۔خوب ! چمک اور آب کی انتہا ہے اُسے پھر سکارف میں چھپالو۔" شفو نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "میری سانس مسموم ہے کہیں یہ سنہری سپنے سنولا نہ جائیں ـــــ بیٹرس تم اتنا حسن اور اتنی زندگی کیا کروگی بہت سے محتاج تمھاری طرف نگاہیں لگائے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھو، میں تم سے یہ سب چیزیں نہیں چاہتا۔ مجھے زندگی اور لمبی عمر، خوبصورتی اور توانائی کی ضرورت نہیں مگر میری یہ تمنا ہے اگر تم مجھے ایک دن کے لیے اپنا رُوپ اور جوانی دے سکو تو میں اُسے بِل آؤں۔میرا دل اُسے دیکھنے کو بے قرار ہے۔"

"میں ضرور دیتی اگر میں دے سکتی۔" اُس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں اور وُہ فرش کی جانب دیکھنے لگی۔

"تمھاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے ؟ دیکھو مجھے آنسو بہت اچھے لگتے ہیں جھلملاتے ہوئے ننھے منے چراغ ـــــ اندھیرے کے سسکتے ہوئے جگنو۔مگر مجھے ان سے ڈر بھی لگتا ہے۔جب یہ آنکھوں سے نکل کر پلکوں پر کانپنے لگتے ہیں تو میرا دل لرزنے لگتا ہے۔انھیں آنکھوں سے نکلنے سے پہلے ہی پونچھ ڈالو۔میں جھلملاتے ہوئے آنسو دیکھ کر نہیں مرنا چاہتا۔ مجھے تو درتی کی موت ہی پسند ہے ـــــ مجھے پتہ ہے تم کیوں رُوتی ہو۔میری جانِ تمنا کا نام سُن کر تمھیں کیپٹن عباس یاد آگیا نا ہ ـــــ"

"زیادہ باتیں نہ کرو۔" بیٹرس نے کہا "سسٹر خفا ہوگی ـــــ اب سونے کی کوشش کرو۔لاؤ میں تمھارا سینہ سہلادوں۔" بیٹرس نے آہستہ سے اس کا گریبان کھولا اور بالوں بھری چھاتی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔شفو نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور خاموش ہوگیا۔ بیٹرس نے دیکھا، اس کی آنکھیں اب پہلے سے زیادہ اندر دھنس گئی تھیں۔کنوئاں روز بروز سوکھتا چلا جا رہا تھا اور اس کے کنارے بھیانک اور گھناؤنے ہوتے جا رہے تھے۔ہونٹوں کی سُرخی اب ختم ہوگئی تھی۔ اور گلوں کی ہڈیاں اب ودبا

کی بربتی کی طرح اُبھر آئی تھیں۔ بیٹرس کو عشق عباس ہی سے ہُوا لیکن پیار سب سے زیادہ شفو پر آیا۔ اگر شفو صحت یاب ہو جائے اس نے سوچا تو کتنا اچھا ہو۔ میں اسے کبھی گھر واپس نہ جانے دُوں۔ وُہ لوگ تو نا اُمید ہو ہی چکے ہیں اور اب انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر ہوتی تو سانلی میں کئی بیڈ خالی تھے۔ کوئی ریزرو کروا لیا ہوتا —— شفو عمر بھر میرے پاس رہے۔ بچوں کی طرح ہر روز مجھ سے پوچھے "یہ ناک رومن ہے؟" فلسفیوں کی طرح میرے سامنے بیٹھ کر کہے "اپنے آنسو پونچھو، بیٹرس، وُہ پلکوں تک پہنچا چاہتے ہیں" اور شاعروں کی طرح میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہے "بیٹرس، مجھے تم سے محبّت نہیں مگر میرا دل چاہتا ہے تمھارے لیے ایسے ملکوتی گانے لکھوں جو پلکوں کی طرح تابناک اور نوجوان بوسوں کی طرح خوشبودار اور گداز ہوں —— مگر دق کے مریض! وُہ تو صحت یاب نہیں ہو سکتے لیکن اگر خدا چاہے تو . . . . پر خُدا نہیں چاہتا"

"خدا کی پناہ" سسٹر نے آکر کہا "بیٹرس یہ تمھارے پارٹ پر فیئر نہیں۔ ایک پیشنٹ پر اتنا وقت لگا دیا۔ اَن فیئر۔ اَن جسٹ۔ پلیز میک ہیسٹ"

شفو نے آنکھیں گھما کر پوچھا "میم صاحب آپ کو باتیں بنانے کے سوا اور بھی کچھ آتا ہے؟ ین فیئر۔ ین جسٹ۔ اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ایک ہی سانس میں چھوڑے جاتی ہیں"

"اوہ پیشنٹ تھرٹی ون!" سسٹر نے مسکرا کر کہا "نیوروٹک ہو گیا ہے۔ نیوروٹک —— اسے ٹین گرین پوٹاسیم برومائیڈ دے دو، ابھی اسی وقت"

جب وُہ چلی گئی تو شفو نے کہا "لاؤ مجھے پوٹاسیم برومائیڈ پلاؤ، بیٹرس" تو وُہ رونکھی ہو گئی "سسٹر تو پاگل ہے" اُس نے چھت کو گھورتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ نرس تم پر بہت مہربان ہے" مسٹر بھوملکا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ہوں" شفو نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"اس کی باڈی کا کٹ دیکھا" مسٹر بھوملکا نے اُسے پھر متوجہ کیا "میری منجھلی سالی سے ہُو بہُو کچھ ملتی ہے۔ ویسی ہی بیک، وہی سینہ اور رانیں تو ایک دم وُہی —— یہ اگر ہمارے مذہب میں ہوتی تو میں اس سے ضرور شادی کرتا" پھر وُہ خاموش

ہو گیا اور شفقو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"مسٹر بھومکا" شفقو نے منہ پھیر کر کہا "ٹی بی کے مریضوں میں باتیں کرنے کی سکت نہیں ہوتی۔ ٹی بی وارڈ کی مجلس کا پہلا اصول ہی یہی ہے کہ ایک مریض بات کیے جاتا ہے اور دوسرے سنے جاتے ہیں۔ جب وہ تھک جاتا ہے تو دوسرا شروع کر دیتا ہے۔ سوال جواب پھیپھڑوں کے بل بوتے پر ہوتے ہیں اور ہمارے پھیپھڑے تو تم جانتے ہو دھنکے جا چکے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" مسٹر بھومکا نے پھر مسکرانے کی کوشش کی "میرا ایک پھیپھڑا تو بالکل شیبڑ ہو چکا ہے اور دوسرا ابھی ہوا ہے۔ اس پر بھی مجھے امید ہے کہ میں ان گرمیوں میں نہیں مروں گا اور اگر میں مدراس میں ہوتا تو بہت سی گرمیاں کاٹ لیتا۔ ادھر پنجاب میں گرمی بہت عجیب قسم کی ہوتی ہے۔ گرمی مدراس میں بھی ہے۔ مگر وہ بڑی لولی (LOVELY) گرمی ہوتی ہے۔ ادھر لوگ پریم کرتا ہے۔ موپلوں سے دوستی گانٹھتا ہے اور وہیل مچھلی کے تیل کی مالش کرتا ہے۔ پنجابی لڑکی بہت کولڈ ہے۔ ہماری طرف تو لڑکیاں بہت جلد ییلڈ (YIELD) کر جاتی ہیں۔ ہماری ملت پریم کی گرمی زیادہ ہے۔"

سپورن سنگھ نے کراہتے ہوئے اُگالدان میں تھوک کر کہا "ہم تو آٹھ مہینے وہاں رہے۔ پر کوئی نہ ملی کنواری نہ شادی شدہ۔ آتی دفعہ ایک کول لڑکی ملی تھی۔ زیادہ خوبصورت تو نہ تھی مگر اس کا جسم بہت اچھا تھا۔ ہم ٹھہرے فوجی۔ اُسے تین روپے تو کیا دینے تھے۔ اُلٹے اُس کی چولی سے چھ آنے نکال لیے۔ شاید اسی پاپ کے بدلے یہاں پڑا ہوں۔ واہگورو کرپا کرے تو اس کی تلاش کر کے تین روپے چھ آنے دے کر آؤں مگر واہگورو۔۔۔۔۔۔"

کامریڈ اصغر مسکرانے لگا۔

"ہاں ہاں!" مسٹر بھومکا نے کہا "کول لڑکیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں مگر ان کے جسم اچھے نہیں ہوتے۔ پر وہ کول لڑکیاں جن کی مائیں دراوڑ ہوتی ہیں جسم کی نہایت اچھی ہوتی ہیں۔ وہ لڑکی بھی کول دراوڑی ہوگی۔"

"شاید" کہہ کر سپورن سنگھ کھانسنے لگا اور تھوک کر تھوک کر اپنے بیڈ پر لٹک گیا۔ سامنے دروازے سے بنڈ من نکلی اور دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ "دیکھا" مسٹر بھومکا

نے پھر کہا "اس کے جسم کا کٹ کتنا اچھا ہے۔ بالکل رانی جیسا۔ میری منجھلی سالی کا نام رانی ہے۔ اس کا کٹ بھی اس سے ملتا ہے۔ وہی بیک وہی سینہ۔۔۔۔"

"مسٹر بھومکا" شفقو نے آنکھیں میچ کر کہا "اس کے کٹ سے ہمیں کیا فائدہ اور رانی کی بیک سے تمہیں کیا حاصل؟ یہ بتاؤ جب تم مرجاؤگے تو تمہیں کوئی رونے کا بھی کہ نہیں؟"

"خدا" کامریڈ اصغر نے مسکرا کر کہا۔

"روئے گا کیوں نہیں؟" مسٹر بھومکا نے شرمندہ ہو کر کہا "سبھی روئے گا۔ ہماری فیملی، ہمارا خاندان ہر ایک روئے گا۔ مگر میں ابھی نہیں مروں گا۔ یہ گرمیاں اور اس سے اگلی گرمیاں پھر اس سے اگلی گرمیاں اور ممکن ہے اس وقت تک کوئی اچھا ٹریٹ منٹ نکل آئے۔"

"ٹی بی کا علاج تو خدا کے پاس بھی نہیں" کامریڈ اصغر کے پہلو سے آواز آئی اور اصغر خوش ہو گیا "خوب بہت خوب"

سیورن سنگھ سنبھل چکا تھا۔ اس نے اپنا منہ پونچھ کر قریب لیٹے ہوئے ہم نفس کی طرف دیکھا جو مر رہا تھا، اتنی خاموشی سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

"بھئی مجھے تو میرا بابو روئے گا" سیورن سنگھ نے لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "یا ندھان سنگھ کھانی کی لڑکی۔ مگر وہ سب کے سامنے نہیں روئے گی —— اکیلی ہر ایک کی نظر بچا کر۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔ اور تو کوئی نہیں"

"گویا کل دو ہوئے" شفقو نے حیران ہو کر کہا "مگر مجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔ میں نے کسی ندھان سنگھ کی لڑکی سے محبت نہیں کی۔ میری ایک خالہ جہلم رہتی ہے۔ اس سے بہت کچھ امید تھی۔ مگر آج کل اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں اور میں ان گرمیوں میں مرجاؤں گا۔ دوسری خالہ کی گود میں دودھ پیتا بچہ ہے۔ کہتے ہیں رونے سے دودھ سوکھ جاتا ہے۔ اپنے بچے کو کون بھوکوں مارے؟ اور میری ماں ہے؟ وہ تو مجھے آج سے بہت پہلے رو چکی ہے۔ جب میں جرمنوں کا قیدی بن کر گیا اور متوفی مشہور ہوا تو میری ماں بہت روئی اور اپنی آنکھیں گنوا بیٹھی۔ اب اس کے پاس رونے کو کچھ بھی نہیں، نہ آنسو نہ آنکھیں! ہاں ایک لڑکی ہے۔ میں نے شب برات کو اس کی پیشانی چومی تھی۔ پر وہ کیوں روئے گی۔ وہ بوسہ تو اس کے ماتھے میں

جذب ہو کر معدوم ہو چکا۔ میری بڑی بہن کا خاوند انگلینڈ گیا ہے۔ اور وہاں میموں سے عشق کرتا ہے۔ وہ مجھے روئے گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ اپنے خاوند کو یاد کر کے رو رہی ہے جس کی بہت سی بچیاں اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہیں۔ کاش کوئی مہندی لگا ہاتھ میرا ماتم کرتا۔" شفقو تھک کر خاموش ہو گیا۔

"کاش خدا کی آنکھوں میں سُرمہ لگا ہوتا اور اُس کے ہاتھ حنا آلود ہوتے۔" کامریڈ اصغر نے کہا۔" کیونکہ وہی ہمیں روئے گا اور وہی مالک روزِ جزا کا اور رب ہے سارے عالموں کا۔"

"تم ہر بات میں خدا کو کیوں کھینچ لاتے ہو۔" صوفی ابراہیم نے کہا۔" اس کے قہر سے ڈرو۔"

کامریڈ ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ پھر اس کے مُنہ سے خون کے چلّو بہنے لگے اور وہ پٹّی سے چپک گیا۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ کامریڈ کب مرے گا۔" مسٹر بھومر کا نے سوال کیا۔

"بہت جلد۔" سپورن سنگھ نے تسلّی آمیز لہجہ میں جواب دیا۔

"نہیں یہ گرمیاں گذار لے گا۔" شفقو نے اس کے چہرے کو بغور دیکھ کر کہا۔

"غلط بالکل غلط۔" مسٹر بھومر کا نے کہا۔" سبھی اس دفعہ مر جائیں گے ——— لیکن میرا ایک پھیپھڑا ابھی تک بالکل ٹھیک ہے۔"

"اچھا دیکھ لیں گے۔" سپورن سنگھ نے کہا۔ اس کا دل مونچھ مروڑنے کو چاہتا تھا تاکہ اس کے دعوے کی تصدیق ہو جائے۔ پھر اس نے اپنے پہلو میں لیٹے ہوئے مریض کو دیکھا۔

"یہ تو مر گیا بھئی۔"

"کون ہے" شفقو نے پوچھا۔

"یہ ٹونٹی تھری۔"

"ابھی نہیں۔" ٹونٹی تھری نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"معاف کرنا۔" سپورن سنگھ نے کہا۔" میں نے تمہارا دل دُکھایا۔"

"کوئی بات نہیں۔" ٹونٹی تھری نے جواب دیا۔" دِل کی خیر ہے۔ میرا پھیپھڑا شدت سے دُکھ رہا ہے۔" پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ایک موٹا سا آدمی تمھیں ملنے آیا ہے۔" بیٹرس نے شفقو سے کہا۔

"کیا نام ہے؟" شفقو نے پوچھا۔

"سعید خاں۔"

"وُہ تو میرا ماموں ہے۔" شفقو نے فخر یہ کہا۔

"لیکن وُہ تو بہت موٹا ہے۔" بیٹرس نے متحیّر ہو کر کہا۔

"پہلے میں بھی موٹا تھا۔ اس ٹی بی نے مجھے لاغر کر دیا۔"

"تمھیں ٹی بی نہیں۔" بیٹرس نے مُنہ پکّا کر کے کہا۔ "یہ شدید کمزوری ہے۔"

مسٹر بھومکا ہنسنے لگا۔

"لیکن بیٹرس ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا حال ہے شفقو میاں۔" سعید ماموں نے سانس روک کر پوچھا اور سنگتروں کا لفافہ جو وُہ کولڈ سٹور زیج سے لایا تھا اس کی پائنتی پر رکھ دیا۔

"اچھا ہے، کوئی خاص تکلیف نہیں۔ اُمید ہے اس دفعہ چلا چلی ہو ہی جائے گی۔" شفقو ہنسا۔

"نا بھئی ایسے نہ کہو، شاید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"شاید ٹی بی کی ڈکشنری میں نہیں ہوتا۔" کامریڈ نے وثوق سے کہا۔

"کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو لے لو۔" سعید ماموں نے بٹوا جیب سے نکال کر کہا۔ "اب تو میرے پاس ہیں پھر شاید ختم ہو جائیں ——— یہاں آئیل انجن خریدنے آیا تھا۔ لکڑی کا بیوپار تو اب تقریباً بند ہی سمجھو۔ جنگ رُک گئی۔ ٹھیکیداری ختم ہو گئی۔ ملتان میں برف کا کارخانہ لگانے کا ارادہ ہے۔ ہر روز ہزار من برف بنے گی۔ دوسرے کارخانوں میں تو یہی چار پانسو من بنتی ہے۔ غفور بھائی کو منیجر بنایا ہے۔ دیکھیں کیا کرتے ہیں۔ حاجی کو پلاسٹکس کا امپورٹ کروا دیا ہے۔ امریکن کمپنی نے دوسری اسّی فرموں کے مقابلہ میں ہمارا انتخاب کیا ہے۔ لائڈز بنک نے ٹھوک کر ہماری حمایت کی ہے۔ راولپنڈی میں دس گھماؤں جگہ اور خرید لی ہے۔ کوٹھیاں بنانے کا ارادہ ہے۔ ایک بنا بنایا بنگلہ مری میں خریدا ہے۔ ہر دفعہ کرایہ کی سر پھٹول مجھ سے نہ ہوتی تھی۔ مقبول کو لاہور سے لائل پور چھ لاریوں کا پرمٹ لے دیا ہے۔ ابّا جان نے تئیس ہزار کے رف رف کمپنی کے حِصّے خرید لیے ہیں۔ میں تو اس کے حق میں نہ تھا۔ تمھاری ممانی نے

کہا تھا۔ہسپتال ہو کر آنا۔نہیں تو بی بی ناراض ہو جائیں گی۔سو بی بی اگر کبھی یہاں آئیں تو میرے متعلق ضرور بتانا۔تم تو بہت ہی لاغر ہو گئے ہو۔اچھا میں اب چلتا ہوں۔ابّا جان اکثر تمھارا ذکر کرتے رہتے ہیں۔"

جب وہ چلے گئے تو کامریڈ نے پوچھا" تھرڈ ی ون، ان سے روپے لے لیے ہوتے۔ دیکھا نہیں بورژوائی ان کی آنکھوں میں کس طرح چھلک رہی تھی۔"

"معاف فرمائیے گا یہ میرے ماموں تھے۔"

"اور تمھیں روپئیں گے؟"

"روپئیں نہ سہی پر یہ ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ امیر ہیں......"

"امارت بھی خدا بخت آور لوگوں کو دیتا ہے" صوفی ابراہیم نے کہا" دیکھا نہیں کیا جسم تھا۔کیا شان تھی کیسی متشرّع ڈاڑھی اور پُرنور چہرہ۔"

"ہر بورژوائی ایسا ہی ہوتا ہے" کامریڈ نے کہا۔

"یہ بورژوائی کیا ہوتا ہے؟" صوفی نے پوچھا۔

"کچھ ہوتا ہو گا بائی ! ہمیں اس سے کیا" سپورن نے جواب دیا اور کان میں انگلی پھیرنے لگا۔

"ہائے کیا جوان تھا" بوٹی میاں نے حقے کا گھونٹ بھر کر کہا" میں نے شفو کو ان بازوؤں میں بھینچ بھینچ کر پالا ہے" اس کی بیوی، جو چھاچھ میں نمک کی ڈلی پھیر رہی تھی، رُک کر بولی" یاد ہے وُہ دن جب شفو چڑیا کا بچہ لے کر ہمارے یہاں آیا تھا اور پنجے میں ڈور باندھ کر اڑانا چاہتا تھا تو میں نے منع کر دیا کہ اس کی ماں یاد کرتی ہو گی اور اس کی تلاش میں خدا جانے کہاں کہاں ماری پھرتی ہو گی اسے چھوڑ دو ورنہ وُہ اس کی یاد میں چیخ چیخ کر اپنی جان دے دے گی" نور بانو نے چھاچھ کا کٹورا زمین پر رکھ دیا اور اوپر دیکھنے لگی" چھت پر چڑھ کر اُس نے چڑیا کا بچہ منڈیر پر بٹھا دیا" وُہ بولی" نیلی نیکر، سنہرے سنہرے بال، سرخ و سفید رنگ، بھولی بھالی باتیں۔ایسے لگتا تھا جیسے ربڑ کے باوے میں جان پڑ گئی ہو۔"

"ہوں ــــــ میں اسے تم سے بہت زیادہ جانتا ہوں" بوٹی میاں نے کہا۔ "اس کے ساتھ ہی میری داستان گوئی ختم ہو گئی۔کھٹ بڑھئی اور سوداگر بچہ کی

کہانی اللہ جانے اُس نے کتنے مرتبہ سُنی لیکن پھر بھی سیر نہ ہوا۔ بی۔ اے کا امتحان دے کر آیا تو اس مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کرسی نکالی۔ اپنے صافہ سے جھاڑ کر دی مگر نہیں مانا۔ میری روٹی توڑ کر کھانی شروع کر دی۔ ہنس کر بولا "بُوٹی میاں، آج تمھیں بھوکا مارنے آیا ہوں۔ تم اس کرسی پر بیٹھ کر کھٹ بڑھئی کی کہانی سناؤ اور میں اس روٹی کی فریاد سنتا ہوں۔" میں ہچکچایا تو روٹی چھوڑ کر روٹھا ہو گیا۔ "اچھا اب میں تمھارے یہاں نہیں آؤں گا۔" مرتا کیا نہ کرتا۔ شروع کر دیا کہ "سوداگر بچہ کھٹ بڑھئی کو لے کر چل دیا۔ چل سو چل۔ منزل در منزل۔ کُوچ در کوچ۔ آگا نزدیک پیچھا دُور، ایک جنگل میں پہنچا۔ دیکھا کہ ایک حُور پری چندے گلاب چندے ماہتاب بال بال موتی پروئے سولہ سنگار کیے بیٹھی ہے۔ . . ." پھر ہنس پڑا اور روٹی کھانی شروع کر دی۔ کہانی ختم ہو گئی اور اس نے لفافے میں ہاتھ ڈال کر کالی سیاہ مشہدی لنگی نکال کر میری گود میں ڈال دی۔ یاد ہے نا، نور بانو، وہی لنگی جو تیرا بھائی لے گیا تھا —— مجھ سے بار بار پوچھتا رہا "پسند ہے، بوٹی میاں، پسند ہے لنگی، . . . . پسند . . . . پسند کی بھی ایک ہی . . . ." بوٹی میاں کے گوشۂ چشم سے دو موٹے موٹے آنسو باہر جھانکنے لگے جو بعد ازاں پھسل کر اس کی چھدری ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔ نور بانو نے کہا "یہ مرغیاں بہت تنگ کرتی ہیں۔ اللہ ان کا بیڑا غرق کرے۔"

"اللہ مرغیوں کا بیڑا غرق نہیں کرتا۔" بُوٹی نے پرے تھُوک کر کہا "وُہ تو . . . وُہ تو . . . . اب میں کیا کہوں اللہ میاں کو۔"

نور بانو جھاڑو دے کر مرغیوں کے پیچھے لپکی تو وہ کٹکٹاتی پھڑپھڑاتی باہر بھاگ گئیں۔

"تھرٹی دن، ایک خوشخبری سنو گے؟" مسٹر بھومرکا نے شفقو کی کھُلی آنکھیں دیکھ کر کہا۔

"ڈاکٹر شاہ آئے تھے، ابھی گئے ہیں۔ آدھ گھنٹہ تک مجھے دیکھتے رہے۔ کہتے تھے۔ تمھارا ایک لنگ تو بالکل اوکے ہے۔ ذرا سا بھی پنکچر نہیں ہوا —— اور بھئی —— ہاں وُہ تمھارے متعلق بہت فکر کرتے تھے۔ بیٹرس کو بتا رہے تھے کہ

ہارڈلی ون ویک آر سو۔ مگر تم گھبراؤ نہیں یار۔ ڈاکٹر لوگوں کے اندازے غلط ہی ہوتے ہیں۔"

"اس میں گھبرانے کی کونسی بات ہے۔" شفو مسکرانے لگا۔" مجھے یہ فیصلہ منظور ہے۔ ایک ہفتہ تو بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بہت زیادہ۔ جتنی جلدی چھٹکارا ہو جائے اتنا ہی اچھا۔"

"خوب"۔۔۔ مسٹر بھومکا نے کہا۔" مدراس میں تمہارے ایسے سور بیر بہت کم ہوتے ہیں۔"

"اچھا" کہہ کر شفو خاموش ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ منہدڑ کے چھدرے چھدرے پودوں میں سے اُس نے سڑک پر گذرنے والے اِکّا دکّا تانگوں کو دیکھا جو بڑی تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ پھر اُس کی نگاہیں نیم کے درختوں تلے کنچے کھیلنے والے لڑکوں پر جم گئیں جو ایک دوسرے کو سالا سالا کہہ کر بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔۔۔۔۔۔

"شیو کر و گے؟" بیٹرس اندر داخل ہوئی۔

"اداس ہوں۔"

"کیوں؟"

"دل نہیں چاہتا۔۔۔ بڑھی ہوئی شیو چہرے کی ہیبت کم کر دیتی ہے۔"

"پھر وُہی بات ۔۔۔ لیکن تمہارے چہرے پر ہیبت ہے کہاں!"

"دیکھو بیٹرس پھر تم نے جھوٹ بولا۔"

"یہ جھوٹ ہے!۔۔۔ کسی سے پُوچھ لو۔ یہ جھوٹ نہیں۔ تمہارا چہرہ بہت اچھا ہے۔ بہت خوبصورت۔ کسی سے پُوچھ لو۔۔۔ ذرا کمزوری ہے۔ وُہ بھی دُور ہو جائے گی۔"

"بیٹرس" شفو نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔" کبھی سُورج مغرب سے بر آمد ہوا ہے؟ کبھی جوالاّ مکھی کے ہونٹوں سے میٹھے سوتے پھُوٹے ہیں۔۔۔ نہیں! تو پھر ٹی بی کا مریض کیسے بچ سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ میں تمھیں ریکارڈ بُک لا کے دکھاتی ہوں ۔۔۔ اور پھر تمھیں ٹی بی ہے کہاں؟"

"پھر وُہی بات —— اچھا یہ بتاؤ میں مروں گا کب ؟"

"شش !" بیٹرس نے لبوں پر اُنگلی رکھ کے کہا" ایسے نہیں کہا کرتے۔"

"کیوں ؟"

"بس یُونہی۔"

"یُونہی کیوں، آخر کوئی بات بھی تو ہو۔"

"ہوتی ہے ایک بات —— سسٹر خفا ہوتی ہے۔"

"—— سسٹر نہ سسٹر —— وہ خفا ہوتی ہے تو میں روز ایسے کہوں گا اور زور زور سے کہوں گا . . . . !"

"اچھا اگر میں بُرا مانوں تو ؟" بیٹرس نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ شفقو نے اپنا لاغر ہاتھ اُٹھا کر بیٹرس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا" نہیں۔"

بیٹرس نے اس کا ہاتھ سہلا کر کہا" تم بڑے اچھے ہو۔ اب تم جلد راضی ہو جاؤ گے۔"

"اچھا" شفقو نے ہولے سے کہا اور بیٹرس کو دیکھنے لگا۔ اُس کے سُرخ اور رسیلے ہونٹ، صحت مند اور جانفزا جسم، خون کی حدت سے تمتمایا ہوا چہرہ اور جوانی بھری آنکھیں جن میں مونی کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ آج اُسے بہت بُری لگیں۔ پہلی مرتبہ اُسے اپنی کمزوری کا احساس ہُوا۔ بیٹرس کا وجود اُسے ایک گالی کی طرح دکھائی دینے لگا جو دُنیا کے تندرستوں نے مریضوں کو دی ہو۔ نہایت ہی بھیانک اور حد درجہ ہتک آمیز! ہر نرس ایک گالی ہے گالی، جگر سوز۔ رُوح فرسا! پھر وُہ محبت بھری آنکھیں بیٹرس کے مرمریں چہرے کو جس میں کامرانی جھلک رہی تھی انتقام اور غصہ سے گھُورنے لگیں۔ نجانے کیوں بیٹرس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ شفقو چلّانے لگا۔

"بیٹرس! بیٹرس! —— روکو ان آنسوؤں کو —— دیکھو یہ مجھے ڈبونے آ رہے ہیں۔ میں ان کے ریلوں کی تاب نہیں رکھتا۔ یہ مجھے خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیں گے۔ ہٹاؤ! ہٹاؤ! پونچھو! پونچھو!" بیٹرس اُٹھ کر چلی گئی اور پتہ نہیں وُہ بدلی پھر کہاں جا کر برسی۔

"میرا دل تو اب بھی یہی چاہتا ہے" چچی نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" چچا بولے۔

"یہی کہ کنیز کی شادی اب بھی شفقو سے ہو جائے۔"

"وہ پاگل ہوتی ہے۔ وہ بیچارہ پتہ نہیں کتنے دن کا مہمان ہے اور لگی ہے بیاہ رچانے۔"

"اوئی توبہ ایک دن کے لیے بھی ہسپتال سے نہیں آسکتا۔"

"اوں ہوں۔"

"اور اس کے حصّے کی زمین بھائی لے جائیں گے؟"

"اور کیا تم؟"

"میری قسمت میں کہاں۔ کنیز کا مقدر اچھا ہوتا تو جبھی بات کھول لیتے۔ مگر کرموں کے لکھے کو کون میٹ سکتا ہے۔"

"خدا کرے ہمارا شفقو لاکھوں برس کی عمر پائے —— یہ زمین اس کے چچا کو نہیں مل سکتی؟"

"نہیں۔ بھائی جو ہیں۔"

"کسی طرح بھی نہیں۔"

"نہیں۔"

"سرکار دربار جا کر بھی نہیں۔"

"ایک دفعہ جو کہہ دیا نہیں۔" چچا بھنّا کر بولے۔

"یا خدا میرے شفقو کی خیر۔ اللہ آمی کرے اتنا بڑا کیا ہے۔ گیارہویں والا کرے۔ سونے کے سہرے لگیں۔" وہ پھر پنکھا جھلنے لگیں اور چچا اخبار آگے رکھ کر دانتوں میں تنکا پھیرنے لگے۔

"وہ کب مارو گے۔ وہ چھاپہ؟" بیٹرس نے ہنس کر پوچھا۔

"وہ بنا کر تھوڑی مارا جاتا ہے —— یہ تو چوری کا معاملہ ہے۔" شفقو نے اپنا ہاتھ اس کی کُہنی پر رکھا تو وہ تڑپ گئی۔

"کیوں؟" شفقو نے متحیر ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں —— زخم ہو گیا۔"

"کیسے؟"

"ایسے ہی۔"

"ایسے کیسے؟"

"ڈاکٹر شاہ نے خون نکالا تھا۔"

"کیوں؟"

"پتہ نہیں!"

"میرے لیے؟"

"پتہ نہیں۔"

"بتاؤ۔ بیٹرس!" شفقو نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر التجا کی۔

"مجھے خبر نہیں۔" اور وُہ اُٹھ کر چل دی۔

شام کو مسٹر بھوسکا کا بیڈ خالی ہو گیا۔ کامریڈ اصغر نے ہنس کر کہا۔ "وہ اس بیماری کے علاج کا منتظر تھا۔ یہ گرمیاں اور اس کے بعد کی گرمیاں اور پھر ٹی بی کا علاج ہو سکے گا۔" اور جب اس کا سٹریچر کامریڈ کے قریب سے گذرا تو وُہ اُٹھ کر بیٹھ گیا "بہت کمزور پرولتاری تھا۔ ہر کمزور پرولتاری مر جائے گا۔ ہر نحیف و نزار محکوم و مجبور محنت کش ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد جوان مرد اور توانا پرولتاری پیدا ہوں گے۔ سُرخ آندھی آئے گی اور سارے بورژوائی قتل ہو جائیں گے..... پھر..... پھر.....!" اُسے کھانسی کا دورہ پڑا اور وُہ کھانستے کھانستے بیحال ہو گیا۔

جب ڈاکٹر انجکشن دے چکے تو شفقو نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ "یہ کیسا ٹیکا تھا ڈاکٹر صاحب!"

"خون کا۔"

"کیسے خون کا؟"

"یہ بیٹرس نے تمہارے لیے دیا تھا —— اپنی مرضی سے۔"

جب ڈاکٹر جا چکا تو شفقو نے سامنے کی الماری میں دھوئے دھائے براق نشتر دانی کو دیکھا جو بجلی کے خوابیدہ کوندوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اُس کا بس چلتا تو فوراً ایک خار اشگاف نیچہ اُٹھا کر اپنے پہلو میں گاڑ دیتا اور بیٹرس کے خون کے ساتھ اس کا اپنا لہو بھی بہہ جاتا، مگر وُہ اُٹھ نہ سکا۔ نشتر کیسے اٹھاتا؟

"سسٹر" ڈاکٹر نے کہا "ٹونٹی تھری کی کنڈیشن دیکھو۔ یہ آج شام تک زندہ نہیں رہے گا۔ اس کے گھر ابھی سے میمو بھیج دو ـــــ کہاں ہے اس کا گھر؟"

"مانٹگمری" سسٹر نے چارٹ پڑھ کر کہا۔

"اوہ مانٹگمری ـــــ بہت دور ہے۔ آج ہی میمو بھیجو۔ ابھی! اس کی کنڈیشن خراب ہے۔ مانٹگمری بہت دور ہے اور کولڈ سٹوریج میں اب جگہ نہیں۔"

بہت اچھا کہہ کر سسٹر نے چارٹ پھر لٹکا دیا۔

"خون دے سکتے ہو؟" ڈاکٹر نے سپورن سنگھ سے پوچھا۔

"میرے بھائی کو لکھ دیجیے جناب۔ وہ آ جائے گا۔"

"کیا جوان ہے؟"

"کسرتی، جناب!"

"کیا کام کرتا ہے؟"

"ہل چلاتا ہے۔ کرایہ پر سامان لادتا ہے۔ کشتی لڑتا ہے اور . . ."

"اور کیا کرتا ہے؟"

"اور کچھ نہیں کرتا جناب۔"

"بہت خوب ـــــ اچھا وہ تمھیں خون دے گا؟"

"کیوں نہیں، جناب۔ وہ اپنا خون جو ہوا۔"

"سسٹر، اسے لکھ دو۔ یہ پیشنٹ پروگریس کرے گا۔ ممکن ہے ریکور کر جائے۔"

"ویل ڈاکٹر" کہہ کر سسٹر نے اس کا چارٹ اتار لیا۔

بیٹرس تھرمامیٹر والی نیلی شیشی لے کر اندر داخل ہوئی۔ شفقو نے اسے جالی کا دروازہ آہستہ سے بند کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ صبح سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے تھوڑا سا لعاب اپنی چھاتی پر لگایا۔ تھرمامیٹر لگا کر بیٹرس گریبان میں ہاتھ ڈال کر اس کا سینہ سہلانے لگی۔

"یہ کیا؟" اس نے اپنی ہتھیلی نکال کر پوچھا۔

"پتہ نہیں۔"

"شاید رال ہے۔ مگر یہ یہاں کیسے پہنچی ـــــ تمھاری گردن تو درد نہیں کرتی؟"

"نہیں۔" شفقو نے جواب دیا۔ بیٹرس اٹھی اور کونے میں رکھی ہوئی چلمچی میں ہاتھ دھونے

لگی۔ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے اپنے گریبان سے رُومال نکالا اور اسے شفقو کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دیا۔

سسٹر نے کہا "ایک عورت تمھیں ملنے آئی ہے۔"

"آنے دو۔" شفقو نے جواب دیا "گو میں بہت تھک گیا ہوں پر اپنوں سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ جہلم والی خالہ اندر داخل ہوئیں وُہ ناک پر رُومال رکھے سہمی سہمی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

"تم تو بہت کمزور ہو گئے ہو شفقو۔" خالہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

"ہاں، خالہ ——— یہ بیماری ہی کچھ ایسی ہے۔ ایک دم ختم نہیں کر دیتی ——— ہاں سچ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ یہاں سوائے کڑوی کسیلی دواؤں اور آبدار نشتروں کے اور کچھ بھی نہیں۔" پھر شفقو ہنسا اور اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔

"میں تو صرف تمھیں دیکھنے آئی ہوں۔ ایک عرصہ سے دل ترس رہا تھا۔ تمھارے چوخانے کوٹ والا فوٹو دیکھ کر رو لیا کرتی ہوں۔"

"رویا نہیں کرتے، خالہ۔" شفقو نے فلسفیانہ انداز میں کہا "آخر کیوں رویا جائے؟"

خالہ اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکیں اور رومال ناک سے پرے ہٹا کر اُسے بغور دیکھنے لگیں۔ آج پہلی مرتبہ ان کا دل چاہا کہ وُہ شفقو سے لپٹ کر اُونچے اُونچے رونے لگیں۔ سیمنٹ کے صاف شفاف اور ٹھنڈے فرش پر کھڑے کھڑے انھیں شفقو کے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ وُہ ہمیشہ اسے کندھے پر اٹھائے پھرتیں۔ اپنے جیب خرچ سے اس کے لیے کھلونے لاتیں اور جب ان کی بڑی بہن شفقو کو مارنے لگتیں تو وُہی آڑے آتیں۔ پھر ان کی شادی ہو گئی اور انھوں نے سب سے زیادہ چیخیں شفقو سے جُدا ہوتے وقت ماریں۔ سسٹر پاس آ کر کھڑی ہو گئی تو خالہ نے کہا "یہ میرا بھانجا ہے، نرس۔ بہت اچھا تیراک تھا۔ پانی میں مچھلی کی طرح لچکتا رہتا۔ میں بڑے شوق سے اس کی تیراکی دیکھتی تھی۔ یُوں تو مجھے اپنی ساری اولاد سے زیادہ اپنے بھانجے بھانجیوں سے اُنس ہے پر اس سے بہت زیادہ محبّت تھی۔ یہ دیکھو۔" خالہ نے آستین چڑھا کر کہا "بچپن میں ایک دفعہ اس نے مجھے یہاں کاٹ کھایا تھا۔" شفقو مسکرانے لگا

"کہاں، خالہ؟" اُس نے کہنیوں کے بل ہو کر پوچھا "مجھے تو یاد نہیں۔"

"ہاں تمھیں اب کہاں یاد ہوگا۔ یہ تو بہت عرصے کی بات ہے۔" خالہ آگے

نہ بڑھ سکیں۔شفقو نے دیکھا۔ ان کے کندھے پر چنبیلی کے پھول ایسا نشان تھا۔خالہ مڑنے لگیں تو بولیں "جاتی دفعہ پھر ملنے آؤں گی۔ اب چلتی ہوں۔ رانی کو گھر اکیلے چھوڑ آئی ہوں۔ اب گھٹنوں چلتی ہے۔ دانت نکال رہی ہے۔ اس دَور میں سارے بچے اکثر بیمار رہتے ہیں" سسٹر خالہ کو برآمدے تک چھوڑنے گئی۔ خالہ نے اسے دو روپے دیتے ہوئے کہا "میرے بھانجے کو کچھ لا دینا"

"تھینک یو" کہہ کر سسٹر نے گلابی رنگ کا نوٹ اپنے گریبان کے اندر اڑس لیا۔ شفقو شیشوں میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

شام کو مس نورا نے بتایا کہ آغا صاحب باہر آئے ہیں۔ جب وُہ کافی دیر تک اندر نہ آئے تو مس نورا باہر گئی۔ آغا صاحب نے بتایا "میں اندر نہیں آسکتا، جلدی میں ہوں۔ شفقو سے پوچھو، اب کیا حال ہے" جب وہ شفقو کا حال بتا کر واپس آگئی تو شفقو نے پوچھا آغا صاحب کیا کہتے تھے "کچھ بھی نہیں" نورا نے جواب دیا۔

"وُہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ سگریٹ پیش کی۔ مگر میں نے نو تھینکس کہہ کر لوٹا دی۔ کیا میں لے لیتی؟" جب شفقو نے کوئی جواب نہ دیا تو وُہ لمبی سانس کھینچ کر بولی "تو اپیل بنگ مین۔ ٹاور نگ پر سنے لٹی"

رات کے آٹھ بجے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سپورن سنگھ نے ٹونٹی لفری کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹ خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور آنکھیں حلقوں میں دھنس کر نا پید ہو چکی تھیں۔ سپورن سنگھ کا دل بھر آیا وہ چمکار کر بولا "ٹونٹی لفری"

"ہوں!" اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

"اب کیا حال ہے؟"

"کچھ ٹھیک نہیں۔ میرے پھیپھڑوں میں شدت کا درد ہے اور میرے حلق میں کڑوے کانٹے کھُبے جا رہے ہیں"

"اوہو ــــ معاف کرنا ٹونٹی لفری۔ کل صبح ہم تمھیں نہ دیکھ سکیں گے۔ واہگورو کرے تمھارا وقت آسانی سے کٹے"

"ہاں ہاں" ٹونٹی لفری آہستہ سے کھانسا "اس میں معافی کی کونسی بات ہے۔

یہاں ہر ایک مرنے کے لیے آتا ہے اور، اور ـــــ پھر . . . . اور" وہ تھک کر خاموش ہو گیا۔

سپورن سنگھ نے کروٹ بدلی اور سو گیا۔

آدھی رات کو بارش اور تیز ہو گئی۔ بجلی زور سے چمکتی۔ پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ درختوں کی شاخیں شائیں شائیں اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا کی آوازیں اِدھر اُدھر بھاگی پھرتی تھیں۔ وارڈ کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اندھیری رات میں کوئی بجرہ سمندر کی آغوش میں خوف ناک لوریاں سُن رہا ہو۔ نرس بوائے سٹریچر لے کر اندر داخل ہوا۔ دو نرسوں کی مدد سے اُس نے سپورن سنگھ کو اس پر لٹایا۔ باہر برآمدے میں اس کا بھائی بارش سے بھیگا ہوا کھڑا تھا۔ وہ اُس کے لیے خون دینے آیا تھا۔ جونہی سٹریچر اس کے پاس پہنچا۔ نرس بوائے نے کہا "اب خون دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے اس خون کو بھی لے جاؤ" اس کا بھائی سپورن سنگھ کی موت پر حیران نہیں ہوا۔ نرم لہجہ میں کہنے لگا "صبح اسے لے جاؤں گا۔ اب تو بارش ہو رہی ہے"

"میں کب کہتا ہوں ابھی لے جاؤ ـــــ یہ صبح ہی ملے گا"

"ست بچن مہاراج" اس نے مشکور ہو کر ہاتھ جوڑے۔ نرس بوائے سٹریچر دھکیلتا آگے چلا گیا۔

جب ٹوینٹی تھری نے آنکھ کھولی تو بیڈ خالی تھا۔ واقعی سپُورن اس صبح اُسے نہ دیکھ سکا۔ منٹگمری سے آئے ہوئے وارثوں کو واپس بھیج دیا گیا۔

آخر بیٹرس کو کیا حق ہے کہ سُرخ و سپید چہرہ لیے ہمارے درمیان گھومتی پھرے۔ خدا نے کیوں اُسے صحت مند بنایا اور ہمیں بیمار۔ وُہ اپنی جوانی، صحت اور تنومندی کی نمائش کر کے ہمارا مذاق اڑاتی ہے۔ اس کے لاشعور میں ہماری کمزوریوں اور بیماریوں کے خلاف تمسخر ہے۔ آخر کیوں اسے اتنا خون سونپا گیا ہے، کیوں ایسی زندگی عطا کی گئی ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ رات بھر تنفو کا مریض اصغر سے باتیں کرتا رہا اور اب وُہ ایک عجیب زاویۂ نگاہ سے انوکھی باتیں سوچ رہا تھا۔

بیٹرس آئی تو اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"کیسے ہو؟" بیٹرس نے پوچھا۔

"اچھا ہوں۔"

"آنکھیں کیوں نہیں کھولتے؟"

"ایسے ہی۔ مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے۔"

"میں سامنے کی کھڑکی پر شیڈ ڈال دوں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"تمہیں کیا ــــ اپنا کام کرو اور جاؤ۔"

بیٹرس حیران رہ گئی۔ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ ٹمپریچر لے کر اور اس کے جوڑوں پر پوڈر چھڑک کر آگے چلی گئی۔ اُسے ڈر لگ رہا تھا کہ شفقو اب صحت یاب نہ ہو سکے گا۔ اس کا رُوکھا سا برتاؤ اور جوڑوں پر ہڈیوں کا خوفناک اُبھار اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ چراغِ سحری ہے۔ جب وُہ پوڈر چھڑک رہی تھی تو اُس نے شفقو کے کولھوں اور گھٹنوں پر بستر کی خراشیں دیکھی تھیں۔ وُہ ابھی اتنی گہری نہ ہوئی تھیں معمولی تھیں۔ مگر ان کے بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ بیٹرس نے روئی کے موٹے موٹے پیڈ ان کے نیچے دے دیے تھے اور خراشوں پر اچھی طرح سے جما دیا تھا۔

"بیٹرس" شفقو پکارا "ذرا اِدھر آنا۔"

بیٹرس پاس گئی تو اُس نے اپنا ماتھا چھُو کر کہا "دیکھنا۔ یہاں درد ہوتا ہے۔ میں نے ابھی ہاتھ لگایا تھا۔ پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دُکھتا ہے۔" جب وُہ جھُک کر اسے دیکھنے لگی تو شفقو نے اپنا تعفّن بھرا سانس اُس کے چہرے پر چھوڑ دیا۔

"کچھ پتہ نہیں چلتا۔" بیٹرس نے اِدھر اُدھر سے دبا کر دیکھا۔

"پھر دیکھو" شفقو نے کہا اور وُہ پھر جھکی۔ اس دفعہ بھی اُس نے اپنا جراثیم بھرا سانس اُس کے شہابی رُخ پر گھٹا کی طرح پھیلا دیا مگر اُس نے محسوس تک نہ کیا۔ شفقو کی سازش مستور رہی۔

وُہ چلی گئی تو شفقو سوچنے لگا کہ سانس تو ایک بے معنی سی عارضی چیز ہے۔ دوسرے دن اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ دن میں کئی بار خون تھوکا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا۔ گالوں کی ہڈیاں اور اُبھر آئیں۔ آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو کر اندھے کنوئیں بن گئے۔ کان کی لویں کنول کے مرجھائے ڈنٹھلوں کی طرح سنولا گئیں۔ انگل

انگل داڑھی رال اور تھوک سے چپک کر سیاہ بانات کا ٹکڑا بن گئی۔ آنکھوں میں غلیظ مادہ کثرت سے بھر گیا اور ہر سانس سے بُو آنے لگی۔ اس کے رواتی زخم اب گہرے ہو گئے تھے اور بستر کی رگڑ سے یوں دُکھتے تھے جیسے کسی نے چٹکی بھر نمک ان پر چھڑک دیا ہو۔ کولہوں کی ہڈیاں نیلی سی جھلی میں لپٹی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں اور اُن کے جوڑ عرصے سے بند چوبی دروازوں کی طرح آوازیں نکالتے محسوس ہوتے تھے۔

جب بیٹرس ڈاکٹر شاہ کو ساتھ لے کر آئی تو انھوں نے کہا "حیرت ہے یہ ابھی تک زندہ ہے" بیٹرس کچھ کہہ نہ سکی۔ خاموش ڈاکٹر کو دیکھتی رہی۔

"خون کا ایک انجکشن اور دو گی؟"

"ضرور!" بیٹرس نے بازو آگے بڑھا کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے خون ٹیوب میں کھینچ کر سرنج بھر لی اور شنقو کے بازو میں گھونپ دی۔ جب ٹیکہ لگ چکا تو ڈاکٹر نے کہا "اس کا خیال رکھو اور ایک گھنٹہ بعد مجھے اطلاع دو۔"

جب شنقو نے آنکھیں کھولیں تو بیٹرس کے بازو سے خون رستا دیکھ کر اپنے بازو کو دیکھنے لگا۔ اس پر سپرٹ سے تر روئی کی .... چھوٹی سی پھریری پڑی تھی۔

"آخر تم ہم مریضوں کو اس طرح کب تک ذلیل کرو گی؟" شنقو نے غصہ سے کہا۔

لیکن بیٹرس چُپ رہی۔ جیسے سُنا ہی نہیں۔ پھر وُہ باہر دیکھنے لگی اور اس انداز میں بیٹھ گئی گویا اب کبھی نہیں بولے گی بلکہ بول ہی نہ سکے گی۔

شنقو کو یہ مکار بھیگی بلّی بہت بُری لگی۔

"ذرا اپنا پن دینا" شنقو نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ بیٹرس نے گریبان سے پن نکالا اور اُسے دے دیا۔ لیکن خود اُسی طرح بیٹھی رہی۔ شنقو کو معلوم تھا کہ بیٹرس جب چارٹ بھرنے آتی ہے اور اس کے ایک ہاتھ میں نیلی شیشی ہوتی ہے۔ تو وُہ پن ہمیشہ مُنہ سے کھولتی ہے۔ آخر اُسے اس طرح صحت مند رہنے کا کیا حق ہے۔ شنقو نے سوچا اور پن کا سرپوش اپنے مُنہ میں ڈال کر خون سے لتھڑ دیا۔ جب وُہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پن بیٹرس کو لوٹا رہا تھا تو اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور پن تپائی پر پڑی ہوئی 'لائی سول' کی ٹرے میں گر پڑا۔ بیٹرس نے اُسے اُٹھایا نہیں ویسے ہی رہنے دیا اور باہر دیکھتی رہی۔ خون کے قطرے اب بھی اس کے بازو سے بیر بہوٹی کی طرح چمٹے ہوئے

تھے۔

ایک شدید قسم کا جذبہ تھا جو شفقو کو زندہ رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک نامکمل سازش تھی جو اسے مرنے نہ دیتی تھی۔ وُہ اپنے منصوبوں کو ڈھیتے نہ دیکھ سکتا تھا۔ جس کی ساری کاوشیں اس کے سامنے ناکام ہو جائیں اور وُہ مر جائے! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

وُہ دن بڑی بے چینی سے گذرا۔ خون سے بھری رال اس کی باچھوں سے بہہ کر ڈاڑھی میں پھیل جاتی اور پھر وہاں سے گردن پر پہنچ کر بستر میں جذب ہو جاتی۔ آنکھیں ایسی بند ہوئی تھیں کہ کھلنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ سر پر چھدرے چھدرے مگر سخت بال بوتل صاف کرنے کا کرم خوردہ برش بنے ہوئے تھے۔ ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو چکا تھا اور ٹھوڑی نوک دار ہو گئی تھی۔ چرچراتی ہڈیوں کے سروں پر ہاتھ پاؤں پتے کی لاش کی طرح چپٹے ہوئے تھے۔ ان پر جلد اس سختی سے تنی ہوئی تھی کہ ماس میں مُنہ دکھائی دیتا تھا۔ رِدائی زخموں سے مٹیلے رنگ کا مادہ بہتے بہتے رُک گیا تھا اور کولھوں کی ہڈیاں ذرا سی جنبش سے کڑکڑا اُٹھتیں۔

لیکن شام کو اس کی حالت بالکل غیر ہو گئی۔ پھیپھڑے پھڑپھڑاتے ہوئے پھٹے جھنڈے کی طرح آواز دینے لگے۔ سانس کی نالی میں تنفس ایسے داخل ہوتا جیسے بھاری بھاری زنجیروں کو پتھروں پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ شفقو نے محسوس کیا جیسے اس کے بدن مٹی کے تیل بھرے کنستروں میں اچانک آگ لگ گئی ہو۔ دھواں نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کڑوا کسیلا بدبودار دھواں۔ آگ کی حدت اور پیلی پیلی روشنی کی چندھیائی ہوئی چھوٹیں کبھی اس کے سینہ کو چیر کر باہر نکلنا چاہتیں، اور کبھی دل اور پھیپھڑوں کے ٹکڑے توڑنے لگتیں۔ پاؤں کی سوجن میں خارش اور اینٹھن برسرِ پیکار تھیں۔ کولھوں اور ٹخنوں کے زخم چیونٹیوں کے بل بنے ہوئے تھے۔ مُنہ سے گہرے اودے رنگ کا خون بہہ رہا تھا جیسے کلیجی گھل گھل کر نکل رہی ہو۔ تشنج ہوتی اور جسم چھوئی موئی ہو جاتا۔ سارا بدن درد کی کانٹھ بن گیا تھا اور اب درد کہیں نہ تھا۔

ڈوروتھی نے اپنی ڈیوٹی سے الگ ہوتے ہوئے نورا سے کہا "نمبر تین کی چادر خون سے بھر گئی ہے۔ اسے بدل لینا۔" لیکن نورا یہ سوچ کر چُپ رہی۔ کہ ابھی مس تھاپر ڈیوٹی پر آنے کی تو چادر بدل جائے گی۔ مس تھاپر نے نورا کو جاتے ہوئے

یقین دلایا کہ چادر بدل دی جائے گی۔ کیونکہ اسے پتہ تھا کہ ایک گھنٹہ تک بیٹرس آنے والی تھی اور وُہی ایسے کام دل لگا کر کیا کرتی تھی۔ کثیف اور غلیظ!

ڈاکٹر شاہ راؤنڈ پر آئے تو انھوں نے مس تھاپر کو دروازہ میں بلا کر پُوچھا۔

"لڑکی دن ختم؟"

مس تھاپر پنجوں کے بل شفقو کے بستر کے پاس آئی۔ وُہ اوندھے منہ لیٹا تھا۔ ذرا دیر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وُہ اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے پاس واپس چلی آئی۔

"کیوں؟" ڈاکٹر نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

"ابھی نہیں!" مس تھاپر نے جواب دیا اور کنکھیوں سے مُسکرانے لگی۔

شفقو کو اوندھے مُنہ لیٹے دیکھ کر بیٹرس تڑپ گئی۔ اس نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شفقو نے اپنی آنکھیں بڑی مشکل سے کھولیں اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے بیٹرس کو گھورنے لگا۔ اس کی کھانسی میں چھوٹے چھوٹے بُلبلے پھٹ رہے تھے اور اس کے سانس میں مدھم سیٹیاں بج رہی تھیں۔

"بیٹرس" شفقو نے آہستہ سے کہا "مجھے اُٹھا کر بٹھاؤ"

بیٹرس نے آہنی چارپائی کی پشت کو اُٹھایا اور وہاں تکیہ لگا دیا۔ پھر شفقو کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اُس نے پشت کے سہارے اُسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ وُہ اسی طرح بغیر پلک جھپکے چھت کو تکنے لگا۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھیں یُوں کھلی ہوئی تھیں جیسے طویل و تاریک سرنگوں کے اگلے دہانے!

"تم آج اتنے پریشان کیوں ہو؟" بیٹرس نے اُسے مضمحل دیکھ کر پوچھا "کوئی یاد آرہا ہے؟"

"نہیں!"

"تو پھر تم اداس کیوں ہو؟"

"یُونہی۔ ویسے ہی!"

"خالد یاد آتا ہے؟"

"نہیں!————" باجی"

"اول ہوں!"

"تو پھر کیا ہے؟ بتاؤ نا —— وہ لڑکی یاد آ رہی ہے جس کی شب برات کو پیشانی چُومی تھی؟"

"ہوں؟ اوں ہوں!"

"دل میں کوئی راز چھپا ہے؟"

"نہیں!"

"کوئی ارمان ہے؟"

"ہاں!"

"کیا؟"

"پتہ نہیں!"

وُہ ایسے ہی چھت کو دیکھے گیا اور مِیٹرس خاموش ہوگئی۔ نرس بوائے نے آکر پُوچھا "حرفی دن زندہ ہے؟" تو مِیٹرس نے رنجیدہ ہو کر اُسے باہر دھکیل دیا۔ ڈورِیتن اپنی ڈیوٹی پر آئی تو مِیٹرس نے کہا "جاؤ تم سو رہو۔ تمھاری جگہ میں ڈیوٹی دوں گی۔"

"تھینک یو!" ڈورِیتن نے اُسے کندھے سے پکڑ کر کہا "آج میرا کزن آیا ہے اور میں ابھی اس سے بڑی لذیذ باتیں کرتی آئی ہُوں!"

شفو اُسی طرح پُشت کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی چھت میں گڑی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ اب بھی پیٹ پر پڑے تھے۔ مِیٹرس سٹول کھینچ کر شفو کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اتنی شدید ڈیوٹی ۔ منٹ منٹ بعد لمبے لمبے چکر اور مکمل رت جگا۔ مِیٹرس نے اپنا ایک کندھا اسی آہنی چارپائی کی پُشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ لمبے لمبے سانس چلے اور پھر ننھے ننھے معصوم خراٹے ان ہونی موسیقی کے نومولود بچوں کی طرح ہمکنے لگے۔ شفو نے مڑ کر دیکھا۔ مِیٹرس سو رہی تھی اور اس کا سکارف ڈھیلا ہو کر ڈھلک گیا تھا۔ اس کے بازوؤں میں خون سے بھری شریانیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اور اس کے ہونٹ چشمۂ حیوان کی ڈہیلی مچھلیوں کی طرح لچک رہے تھے۔ وُہ خاموش تھی۔ بلب چپ چاپ اپنی روشنی بکھیرے جا رہا تھا اور پنکھا ایک ہی رفتار سے آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔ شفو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی سو رہا تھا اور کوئی مر چکا تھا۔ وہ اپنے سُوکھے ہوئے ہاتھوں پر بوجھ ڈال کر اُٹھا۔ ہڈیاں چرچرائیں۔ سارا ڈھانچا چیخا اور سانس اُکھڑ گیا۔ اُس

نے جلدی سے اپنے خون اور رال سے لتھڑے ہوئے مُنہ کو بلیڑس کے لبوں پر رکھ دیا۔ زور لگا نے پر بھی وُہ اس کے لب کو اپنے مُنہ میں نہ کھینچ سکا اور وہیں پٹی پر لٹک گیا۔ گلے کے گرد لپٹا ہوا غلیظ موم جامہ نیچے ڈھلک گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ اگر کامریڈ اصغر زندہ ہوتا تو ضرور اسے "بہادر پرولتاری" کے نام سے پکارتا۔

اگلے دن ماموں نذر نے بوڑھی میاں کو آدمیوں سے ایک طرف لے جا کر کہا۔
"قبر ذرا گہری کھُدوانا۔ یہ مرض بڑا نامراد ہوتا ہے۔"

توتا کہانی

ایک دن کاشی کی سمت سے آنے والے بادل نہ جانے ادھر کیسے چلے آئے کہ سارا شہر اندھیارے کی لپیٹ میں آ گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہم چار دوست ہوسٹل کے ایک کمرے میں سٹو و لیمپ کے ارد گرد کیتلی سے اُٹھتی ہوئی بھاپ میں اپنے سگرٹوں کا دبیز دھواں ملا ملا کر نظارہ کر رہے تھے۔ سخت سردی میں ایسی شدید بارش کھڑکی کے شیشوں پر پتہ نہیں کونسی گت بجا رہی تھی اور دریچوں کے جھنجھناتے ہوئے پٹ معلوم نہیں کیا تال دے رہے تھے۔ ہمیں تو اتنا یاد ہے کہ برکھا کی مینڈک ایسی ٹھنڈی رانی بار بار ہمارے مُنہ چُوم کر خنکی حاصل کرنے کے لیے کسی چور دروازے سے باہر نکل جاتی تھی اور ہمیں یُوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ہم کسی بے پیندے کی کشتی میں کرسمس کارڈوں والی نیم برفیلی جھیلیں تیزی سے طے کر رہے ہوں۔

جب ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہمارے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا تو حامد نے کہا "تم نے میرا جو کارنامہ سُننے کے لیے مجھے یہاں چائے کی دعوت دی ہے وُہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا ایثار ہے جو میں ایک عفّت مآب لڑکی کی خاطر کر سکا۔ شاید تم میں اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو لیکن اس کی برتری کے تم یقیناً قائل ہو جاؤ گے ——— یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور میرا ایک اور ساتھی ایک باورچی کے ساتھ کرشن نگر کے ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں ایک کُنبہ آباد تھا۔ ہم میں سے باورچی کے سوا کسی نے بھی ایڑیاں اُٹھا کر دیوار کے اُس پار جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس پر بھی وُہ لوگ ہمیں شریف نہ سمجھتے تھے اور السلامُ علیکم کا جواب بڑی تلخی سے دیا کرتے تھے۔ خجستہ بڑی بڑی آنکھوں والی سانولے رنگ کی ایک ایسی لڑکی تھی جس کے سینڈل کی چوبی ایڑیاں باہر سے کافی گھسی ہوئی تھیں اور جب وُہ چلتے ہوئے ایک قدم اُٹھاتی تو دوسرے پاؤں کی ایڑی جسم کے بوجھ سے نیچے کو پھیل جاتی اور جب وُہ اِس قدم کو اُٹھاتی تو دبی چوبی ایڑی ایک

جھٹکے سے آگے بڑھتی۔ اس سے تھیں اس کے جسم کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ خجستہ کا باپ پتہ نہیں کس دفتر میں ملازم تھا مگر اس کی ماں دل کے عارضہ کی پرانی بیمار تھی اور ایک ایسی حاکم تھی جو ہر گھریلو کام کی فائیل پر "فوری" کی چیٹ لگا دیا کرتی تھی۔

حیدر آباد سندھ سے خجستہ کی پھوپھی صرف بات پکی کرنے یہاں آئی تھیں اور ہفتہ دنوں سے یہیں رہ رہی تھیں۔ ایک دن دوپہر کو انھوں نے جہانگیر کے مقبرے کی سیر کا پروگرام مرتب کیا جو میں نے اپنے کوٹھے پر سے بغیر ایڑیاں اُٹھائے سُن لیا۔

خجستہ سے میری ملاقات بس یُونہی سرسری سی تھی۔ میں اپنے کوٹھے پر آنے کا اعلان شبلی کے اشعار سے کیا کرتا اور وُہ اپنی چھت پر آکر زور سے پکارتی "سالے کپڑے اُتار لاؤں، امّی؟" اور ہماری ملاقات ہو جاتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ الگنی پر ڈالا ہوا ان کا کوئی رومال سُوکھ کر ہوا سے اڑتا ہوا ہمارے کوٹھے پر آجاتا اور میں اس کی آمد کی خبر پاکر رُومال کی گیند اپنے کوٹھے سے ان کے یہاں پھینکتا اور کہتا "آپ کا رومال ہے۔ اڑ کر ہمارے یہاں پہنچ گیا تھا" لیکن اس کے جواب میں صرف "شُکریہ" کا ایک لفظ وصول ہوتا۔ میرے ساتھی کو دیرینہ زکام کی شکایت تھی۔ وُہ میرے اس طرح رُومال لوٹا دینے پر بہت چیں بجبیں ہوتا اور اکثر ایک ہی قصہ سنایا کرتا کہ کس طرح اس نے ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا منصوبہ باندھا ورا سے اس ارادے سے باخبر کر کے اس کی اجازت حاصل کی اور پھر جب وقت مقررہ آپہنچا اور اس لڑکی نے ڈیوڑھی کا دروازہ رات بھر کھُلا رکھا تو وُہ دبے پاؤں ان کے گھر میں داخل ہوا اور ٹٹولتے ٹٹولتے ان کی ایک اصیل مُرغی اغوا کر کے لے گیا جسے اس نے لونگ اور جائفل کا بگھار دے کر صبح شام دو وقت ضیافت اڑائی۔ لیکن میں تو ہمیشہ رُومال واپس کر دیا کرتا تھا کیونکہ رومال نہ تو بگھارا جا سکتا ہے اور نہ مجھے کبھی زکام ہُوا ہے۔

جس جمعہ کو انھیں جہانگیر کے مقبرہ کی سیر کو جانا تھا اُس دن صبح ہی صبح ان کے یہاں پکوان پکنے لگے۔ ان پکوانوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر خجستہ نے حصّہ لیا چونکہ کفگیر بار بار دیگچی سے ٹکرا رہا تھا مجھے معلوم ہو گیا کہ کوئی اناڑی باورچی

اپنی پھُرتی کی داد لینا چاہتا ہے اور اس گھر میں خجستہ کے علاوہ اور کون اناڑی ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنی سائیکل برآمدے میں نکالی۔ اُسے پرانی جراب سے صاف کیا اور اس کی ایک ایک کل اور پرزے کو "ایونگ اِن پیرِس ہیر آئیل" سے مالا مال کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مقبرہ شہر سے کافی دُور ہے اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی سائیکلیں جواب دے جاتی ہیں۔

جب باورچی نے سائیکل نکال کر باہر گلی میں کھڑی کر دی تو میں نے ٹائی کی گرہ پر بُرش کرتے ہوئے کہا "میرا انتظار نہ کرنا۔ میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا" اُس نے ایک لمحہ کے لیے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر بڑبڑاتا ہوا اندر باورچی خانہ میں چلا گیا جہاں اُس نے میرے حصّے کا آٹا گوندھ کر ابھی چنگیری سے ڈھانپ رکھا تھا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں مقبرے کی چار دیواری میں گھاس کے پلاٹ پر لیٹا ان کا انتظار کرتا رہا۔ جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بھی ادھر سیر کو نہ آیا اور میں چار دیواری کی محرابوں کو بار بار گن کر چار سے ضرب دیتا اور تین پر تقسیم کرتا رہا۔ ایک بجے کے قریب صدر دروازے کے سامنے ایک تانگہ رُکا اور اس میں سے تین برقعہ پوش عورتیں اُتریں۔ جن میں سے ایک کا بُرقعہ سیاہ تھا اور اس کے سینڈل کی ایڑیاں گھسی ہوئی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور خراماں خراماں مقبرے کی عمارت کو چل دیا۔ سرو سہمے ہوئے مجھے اپنے قریب سے گذرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ باغ سنسان تھا۔ روِشیں درختوں کے سُوکھے ہوئے پتوں سے اٹی ہوئی تھیں اور فوارے کا پانی لے کر بہنے والی نہریں گھاس پھونس مٹی اور خشک و سبز ٹہنیوں کو اپنے کناروں میں دبائے آرام سے لیٹی تھیں اور مجھے ایسے لگا جیسے جہانگیر کی قبر کے اِردگرد ہر قسم کی اور بہت سی قبریں ہوں۔ لمبی، ترچھی، آڑی، گول، گہری۔

بوٹ اتارتے ہوئے میں نے لڑکے سے پوچھا "مجاور کہاں ہے؟" تو اس نے زور سے ناک صاف کر کے کہا "جمعہ پڑھنے"۔

اس مختصر سے جواب کے بعد میں نے اس سے کچھ اور پوچھنے کی جرأت نہیں

کی اور چپ چاپ مینار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر میں نے راوی کو ایک نظر دیکھا اور پھر سبزی مائل مٹیالے درختوں کے درمیان ان تینوں کا انتظار کرنے لگا۔

وُہ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور اُوپر سے مجھے ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے وُہ صدیوں سے رینگ رہی ہوں اور فاصلہ ان کے سامنے ہولے ہولے پھیل رہا ہو۔ وقت گذارنے کے لیے میں نے سگرٹ کا سہارا ڈھونڈا اور جب سگرٹ بالکل راکھ ہو گئی تو وُہ نظروں سے معدوم ہو گئیں۔ شاید وُہ اسی لڑکے کی باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں!

جب اُس نے مینار کی سب سیڑھیاں چڑھ کر آخری مرتبہ لمبی ساری "اُف" کی تو میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سیڑھیوں کی ناکر بندی کر کے کہنے لگا "مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی"۔ اس نے خوف اور حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی "آپ کون ہیں؟" میں نے کہا "بہتر تھا تم نے مجھ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا۔ لیکن اب جو پوچھ لیا ہے تو سنو میں وُہی چھوٹا سا تکیہ ہوں جسے تم بچپن میں اپنے سینہ سے لگائے پھرتی تھیں اور میں انہی رنگ برنگی چیزوں کا عکس ہوں جنھیں اوڑھ کر تم ملانی جی کے یہاں پڑھنے جاتی تھیں اور میں وہی تتر یر ماموں زاد بھائی ہوں جس کے متعلق تمھیں تمھاری کلاس فیلو کیسی کیسی مزے دار باتیں سنایا کرتی تھی۔ اب تمھی مجھ سے پوچھ رہی ہو میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟ یاد نہیں، جب تم بورڈنگ میں رہا کرتی تھیں تو تم نے مجھے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا اور تم اپنی اُستانی کی گرویدہ ہو گئیں۔ جب تم صبح سویرے سکول کے باغ سے کلیوں کی جھولی بھر کر اپنی اُستانی کے انتظار میں سائنس رُوم کی سیڑھیوں پر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس وقت تمھیں اسی کا تو انتظار ہوتا تھا جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا اور آج جب وُہ خواب سچا ہو گیا ہے تو تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں کون ہوں؟" اُس نے رونکھی ہو کر کہا "میں اپنی امّی کو پکارتی ہُوں ......"

میں نے کہا "تم ہر روز کوٹھے پر آ کر اپنی امّی کو پکارا کرتی ہو مگر بلانی کسی

اور کو ہو۔ ہر روز رات کو تم اپنے نرم اور گداز بستر سے اُٹھ کر میری طرف آنے کا قصد کرتی ہو۔ مگر تم نے اپنی پسلیوں کے اندر دل کا ایک ایسا طوطا پال رکھا ہے جو تمھیں بھیانک باتیں سُنا سُنا کر ڈرا دیتا ہے۔ کیا اس وقت تم اپنی امّی کو پکار کر یہ نہیں کہہ سکتی ہو کہ اس طوطے کی گردن مروڑ دیں؟ لیکن تم اپنی امّی کو پکارتی ہی کب ہو؟ تمھیں آواز دینا نہیں آتی۔ اب بھی تم اپنی امّی کو آواز دے کر مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ وُہ اختلاجِ قلب کی مریض ہیں اور کئی گھنٹوں میں بھی یہ سیڑھیاں طے نہیں کر سکتیں۔ تم اس طرح کب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہو گی؟"

بارش کے دو موٹے قطروں ایسے بڑے بڑے آنسو اس کی ابریشمی پلکوں پر تھرکنے لگے اور اُس نے کہا "دھوکا! دھوکا!"

"ہاں" میں نے جواب دیا "تم خود فریبی کے سُنہرے جال خود ہی بُنتی ہو اور اس میں خود اُلجھ کر رہ جاتی ہو۔ اس دن جب تمھارا کاڑھا ہؤا اسفید رومال ہمارے کوٹھے پر آ کر گرا تو تم نے جھلا کر کتنے زور سے کہا تھا "یہ کیا مصیبت ہے" در اصل تمھارا مطلب تھا "یہ کتنی بڑی راحت ہے" اور تم راحت کو اُجاگر کرنے کے لیے اس کے ارد گرد مصیبتوں کے پُھلتے ہوئے انبار لگاتی رہی ہو۔ تم نے ہر مسرّت کی طرف منفیانہ پیش قدمی کی ہے اور آج تک کرتی رہی ہو لیکن ......" اس نے اپنے برقعے کے نقاب کو انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا "میں نے کونسی خوشی حاصل کی؟ مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ تم کون ہو" میں نے کہا "تم خوشیاں اکٹھی کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی چھولداریاں نصب کرتی ہو۔ مگر ان کی طنابیں بہت کمزور ہوتی ہیں ہر صبح جب سورج کی پہلی کرن دروازے کی جھری میں داخل ہو کر تمھیں بیدار کر کے کہتی ہے۔ اُٹھو میں تمھارے لیے خوشیاں لائی ہوں تو تم ہڑبڑا کر اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرتی ہو اور سراسیمہ ہو کر پوچھتی ہو "میری کل کی خوشیاں کہاں گئیں؟" اور اس طرح ہر روز تمھاری مسرّتوں کا بنک دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ آسمان پر جب میری روح نے تمھاری رُوح سے کہا کہ زمین پر پہنچ کر ہم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہونگی تو تمھاری رُوح، روح القدس کے پروں کی طرح پھڑپھڑائی اور تم مجلے لنکا کی

پہاڑیوں میں ڈھونڈتی رہیں اور آج جب ہم اس مینار پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں تو تم مجھے پہچاننے سے معذوری ظاہر کر رہی ہو۔ جب تم ٹائی فائڈ میں مبتلا ہو کر اپنی جان سے بیزار ہو گئی تھیں۔ اس وقت تمہارے مُنہ میں تھرما میٹر لگا کر بالوں بھری کلائی پر "رولیکس" کی گھڑی میں کون وقت دیکھتا رہا اور کون تمہارے ٹمپریچر کا چارٹ بھرتا رہا تھا۔ آج تم اس کلائی کو، اس گھڑی کو تو پہچان رہی ہو مگر اس آدمی سے نامانوس ہو!"

اس نے گھبرا کر پوچھا "تم کلیم ہو؟ لیکن تم کلیم کیسے ہو سکتے ہو؟ تم تو۔ تم تو۔" پھر اُس نے کہا "میرا راستہ چھوڑ دو۔ میں نیچے جانا چاہتی ہوں۔"

میں نے جواب دیا "اس جگہ سے کوئی راستہ نیچے کو نہیں جاتا۔ ہم تو تحت الثریٰ میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ یوں کہو۔ آؤ اُوپر چلیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے۔ تم اوپر نہیں جا سکو گی۔ تم نیچے نہیں جا سکو گی۔ تم نے یہ بات اسی لیے کہی ہے کہ تم یہاں کھڑی رہو اور میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہ آنے پائے کہ تم یہاں سے جا بھی سکتی ہو۔ تم نے مجھے ایک دفعہ بُلایا تھا اور ٹال دیا تھا۔ اب دوسری مرتبہ بلایا ہے اور پھر جھجک رہی ہو۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو تمہیں بُلاتا ہی نہیں۔"

اُس نے روتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں کب بُلایا؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم یہاں ہو تو میں کبھی بھی اُوپر نہ آتی۔ بلکہ میں اس مقام پر ہی نہ آتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تمہارے جیسے بدمعاش۔ بدمعاش۔ ۔ ۔ ۔" اور پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اُس کا کندھا تھپک کر کہا "ہم جسے ظالم کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا اپنا پیار ہوتا ہے۔ ہم جسے مایوسی سمجھتے ہیں وہ ہماری اُبھرتی ہوئی آس کی زمردیں کلغی ہوتی ہے اور جسے تم بدمعاش کہتی ہو وہ تمہارا محبوب ہوتا ہے۔ اگر تمہیں کسی کی محبوبہ بننے کی سعادت نصیب ہوتی تو تم یقیناً ایسا نہ کہتیں۔ لیکن رونا تو یہی ہے کہ تم بچپن سے لے کر اب تک محبت کرتی آئی ہو اور بڑھاپے میں بھی اپنے عاشقانہ جذبات سے گریز نہ کر سکو گی۔ پتہ نہیں اب تم مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ تم نے بڑی مشکل سے ریل گاڑی کی

چھت سے بلب چُرایا ہے اور اب اسے پھر اسی جگہ لگا دینے کی سوچ رہی ہو۔ اس طرح سے تم دو چوریاں کرو گی۔ ایک ریل گاڑی کی اور ایک اس چور کی جس نے یہ قمقمہ چُرایا ہے۔"

اُس نے آنسو پونچھ کر کہا "میری پھوپھی بھی سانقہ ہیں اور میں ان کے لڑکے سے منسوب ہو چکی ہوں۔ تم کیوں . . . . ."

میں نے کہا "تم اسی سے منسوب ہو جس کا انتظار تم نے سائنس روم کی سیڑھیوں پر کیا۔ تم اسی سے بیاہی جاؤ گی جس کے لیے تم لنکا کی پہاڑیوں میں ماری ماری پھری ہو۔ تمھارے پھوپھی زاد بھائی کا وجود محض ایک حادثہ ہے۔ موٹر پہلے زمزمہ کے چبوترے سے ٹکراتی ہے۔ حادثہ بعد میں اُسے الٹا کر اس کے مڈگارڈ اور بتیاں توڑ دیتا ہے۔"

اس نے کہا "مجھے معلوم نہ تھا کہ کوئی دیوانہ مقبرہ جہانگیر کے مینار میں چھپا ہوا ہے۔ اگر تم پاگل ہو تو . . . . ."

میں نے جواب دیا "واقعی تم پاگل ہو۔ لیکن تم مینار میں چھپی ہوئی نہیں ہو بلکہ اس پر کھڑی ہو کر ادرگرد کی چیزوں کو روشنی بخش رہی ہو۔ تھی تو جہانگیر ہو جس نے اپنی سلطنت اپنی محبوبہ کے ہاتھوں شراب کے ایک پیالے اور پاؤ بھر کبابوں کے عوض بیچ دی تھی۔ لیکن تمھاری محبوبہ کو یہ سودا کس قدر مہنگا پڑا۔ اُدھر دیکھو! وہاں تمھاری محبوبہ اسی سودے میں گھاٹا کھا کر اتنی ملول اور اس قدر پریشان ہے کہ اس کے تعویذ کی خاک تک اس تجارت کی نذر ہو چکی ہے —— اب تم اس کے نام کو بھی خاک میں ملانے پر اتر آئی ہو، اور اتنی بلندی پر چڑھ کر بولی دے رہی ہو۔"

اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور دھوئی دھائی آنکھوں کی سفیدی بر نیلی ہو کر کافور کی ٹکیاں بن گئی تھی۔ اس نے اپنے لب کھولے اور ہارمونیم کے پردوں ایسے دانتوں میں اپنی سُرخ سُرخ زبان دبا لی۔ پھر اپنے گوشۂ چشم سے مجھے دیکھا اور بولی "تم ہمارے پڑوسی تو نہیں؟"

میں نے کہا "ہاں تم میری پڑوسی ہو اور میرے مکان کے گرد جو کوئی بھی

رہنا ہے وُہ میرا پڑوسی ہے۔ پر میں تو اس طوطے کا ہمسایہ ہوں جو ہر رات تمھیں مجھ سے بدظن کرنے کے لیے ایک کہانی سُنایا کرتا ہے۔ اس کی ہر کہانی میرے گھر کے دروازوں میں ایک ایک میخ بن کر گڑی ہوئی ہے اور میرے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ تم ہر شام وُہ میخیں اکھاڑنے آتی ہو مگر ایک نئی ٹھونک کر چلی جاتی ہو۔ اور میں صبح سے شام تک دیواروں کو ناخنوں سے کھُرچ کھُرچ کر نقب لگانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میرے گھر کی دیواریں ہاتھی کے کھال سے بنی ہیں جو قطبی ستارہ نکلتے ہی اپنے زخموں کو رفو کر لیتی ہیں۔"

اُس نے ٹھوڑی کے نیچے برقعے کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا" تم بڑی مزیدار باتیں کرتے ہو۔ یہ تم نے کہاں سے سیکھیں؟"

میں نے کہا" تمھارا مطلب ہے کہ میں اپنا سبق بھُولا نہیں۔ میں بڑا ہونہار شاگرد ہوں اور اپنے معلّم کے سامنے آموختہ بڑے حسن اور سلیقہ سے دُہرا سکتا ہوں۔"

اس پر وُہ مسکرانے لگی اور اس کے گالوں میں دو ننھّے گڑھے پیدا ہو گئے۔ رنگے ہوئے ناخنوں والا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولی" مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی اسی قدر بے قرار ہو۔ میں نے سوچا۔ دیواریں کھُرچتے کھُرچتے تمھاری انگلیوں میں ناسور ہو جائیں گے اور تم اجگر کی طرح کینچلی چڑھا کر میٹھی نیند سو جاؤ گے۔ لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ تم دُھن کے پکّے نکلے —— آؤ اب ہم دونوں مل کر اس طوطے کی گردن مروڑ دیں۔"

میں نے کہا" اس طوطے کو نہ مارنا۔ اس میں میری جان ہے۔ اگر میری جان نکل گئی تو تم مر جاؤ گی۔"

اس نے کہا" مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔"

میں نے جواب دیا" مجھے بھی اپنی زندگی کی پروا نہیں۔ لیکن مجھے طوطے کی زندگی عزیز ہے۔"

اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا" لیکن میرا پھوپھی زاد بھائی اس طوطے کو مار ڈالے گا۔ کیونکہ اُس کی ناک بلّی جیسی ہے اور اس کی آنکھیں شکرے کی

طرح تیز ہیں۔"

میں نے اس کے سر کو کندھے سے لگا کر تھپکا اور کہا "تم فکر نہ کرو۔ وہ اسے ہرگز نہیں پہنچا سکتا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ بھی جلن میں آ کے ملیریا پال لے۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہو گا۔ وہ ایک تاجر ہے اور تاجر ایسی چیزیں نہیں پالا کرتے جن میں اچھا خاصا نفع نہ ہو۔"

اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے میری ٹائی پر ناک رگڑتے ہوئے کہا "ایک مرتبہ جب میں کمرۂ امتحان میں سوال حل کر رہی تھی تو تم نے اچانک آن کر مجھے گدگدا دیا تھا اور میں نے جل کر کہا تھا۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ یہاں نہ آؤں گا لیکن اب میرا وقت خراب کرنے کو یہاں بھی پہنچ گئے ہو تو تم نے قسم کھا کر جواب دیا تھا کہ میں نہیں آیا ہوں تمھیں وہم ہو رہا ہے۔ اس پر میں نے تنگ آ کر کہہ دیا تھا کہ کتنا جھوٹ بولتے ہیں آپ جہنم میں جائیں گے۔ کیا تم میرا مطلب سمجھے تھے؟"

میں نے سر ہلا کر کہا "نہیں۔"

اس نے اپنا ماتھا میری چھاتی پر ہولے ہولے مارتے ہوئے کہا "آپ سے ملنے کی تمنا پہلے ایک چنگاری بن کر سلگتی رہی۔ اس کے بعد فوراً بھڑک اٹھی اور آگ کے نارنجی شعلوں نے مجھے دن رات جلانا شروع کر دیا —— میں آپ کو اسی جہنم میں بھیجنا چاہتی تھی۔"

میں نے کہا "تمھاری باتیں تو پہیلیاں ہیں اور میں صرف سیدھی سادی باتیں سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ تمھارے اس معمّہ کو کیونکر حل کرتا!"

پھر ہم دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا جس میں وہ اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور آہستہ آہستہ کچھ گنگناتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ اور پھولے ہوئے سانسوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اس کی گود میں سے سر اٹھا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میں نے اس کو دیکھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں سکون اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر کہا "یہ ہیرے کی انگوٹھی ہے اور میری زندگی ختم کرنے کے لیے کافی ہو گی۔ اس طرح میں اپنی اچھی

اور اپنی پھوپھی کی طعن آمیز باتیں سننے سے بچ جاؤں گی"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا اُلٹا ہاتھ لبوں کی طرف بڑھایا لیکن میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اُس نے زور لگایا اور اسی زور آزمائی میں ہم اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنی ساری قوت سے اُسے فرش پر گرا کر ایک عصمت مآب لڑکی کی عفت اور عزت برقرار رکھنے کے لیے میں مینار کی بلندی سے نیچے کُود گیا۔

عجیب بادشاہ

کراچی کافی ہاؤس کی سیڑھیاں اُتر کر جب میں اپنی کرائے کی سائیکل کا تالا کھولنے لگا تو کسی نے پیچھے سے آ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سیدھے کھڑے ہو کر میں اس ہاتھ پر دیر تک ہاتھ پھیرتا رہا لیکن پتہ نہ چلا کہ کون ہے۔ لمبی لمبی مضبوط اُنگلیاں، پُشتِ دست پر سخت بال، بڑھے ہوئے ناخن، سخت گرفت کی وجہ سے کلائی پر اُبھری ہوئی نسیں اور سرسوں کے تیل کی سگریٹ میں ملی جلی خوشبو۔

"معظم" میں نے کہا۔

مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"قمر"

لیکن اس مرتبہ بھی کوئی نہ بولا۔

"ممتاز"

اب بھی ہاتھ میری آنکھوں پر ہی رہا۔

ایک ایک کر کے میں نے اپنے تمام زندہ اور مُردہ دوستوں کے نام گنوائے مگر میری آنکھوں سے وُہ ہاتھ نہ ہٹا۔ پھر میں نے اپنا نام لے کر کہا "اب چھوٹے صاحب کہیں غلط فہمی میں تو میری آنکھیں بند نہیں کر رکھیں" اس پر وُہ ذرا سا ہنسا اور ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زمان میلی سی نیلے رنگ کی اچکن پہنے مُسکرا رہا تھا۔ میں اپنی فائل زمین پر پھینک کر اس سے لپٹ گیا۔ پورے بارہ سال ایک دوسرے سے جُدا رہنے کی مکافات ہم نے یوں کی کہ دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے اور پٹڑیوں چلنے والے راہ گیر پیچھے مڑ مڑ کر دُور تک ہمیں دیکھتے رہے۔ میں نے ٹھوڑی اس کے کندھے پر رگڑتے ہوئے پوچھا "اتنا عرصہ کہاں رہے ظالم؟" تو اس نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کر کہا "آبادان"۔

"آبادان؟" میں نے ہٹ کر پوچھا۔

"ہوں"۔ زمان نے اپنی اچکن کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے اور بولا "تم سے جُدا ہو کر چند مہینے تو بمبئی میں گذارے ۔ اس کے بعد میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں ملازم ہو کر آبادان چلا گیا اور اتنا عرصہ وہیں رہا اور مجھے وہاں سے لوٹے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔"

"مگر تم نے آج تک مجھے کوئی خط کیوں نہ لکھا؟" میں نے پوچھا۔

"خط"! اُس نے مسکرانے کی کوشش کی "یار میں نے لکھا ہی نہیں۔ کسی کو بھی نہیں لکھا۔ تمھیں معلوم ہے۔ یار، مجھے خط لکھنے کی عادت ہی نہیں"

میں نے کہا" یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ۔ عادت نہیں تو نہ سہی ۔ مجھے تو لکھا ہوتا!"
اس پر وُہ مسکرانے لگا اور بولا" اب جو مل گئے ہو تو سارے خط زبانی سُنا دُوں گا۔ لیکن اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے ۔ مجھے سٹر پٹو مائی سین کا پرمٹ لینا ہے اور دفتر ابھی بند ہو جائیں گے۔"

"سٹرپٹو مائی سین کا پرمٹ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں"! وُہ آہستہ سے بولا "ڈاکٹر نے یہی دوا تجویز کی ہے ــــ اور ــــ یار ــــ اچھا بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے ۔ مجھے اپنی رہائش کا پتہ بتلا دو۔"

میں نے ڈائری سے ایک ورق پھاڑ کر اس پر اپنا پتہ لکھ دیا اور اُس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا نقشہ بنا کر بھی اُسے سمجھا دیا کہ صدر ٹرام جنکشن کے سامنے جو کھلی سڑک ہے۔ اس کے پہلے بائیں موڑ پر ایک مسجد ہے مسجد کے ساتھ ایک لائبریری ہے اور لائبریری سے چند قدم کے فاصلہ پر دائیں ہاتھ ہمارا ہوٹل ہے۔ اس کے آٹھویں کمرے میں رہتا ہوں ۔ زمان چلنے لگا تو میں نے کہا "یار تمھارے چلے جانے کے بعد سیما بھی اچانک غائب ہو گئی اور اس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔"

"اچھا"! اس نے بے پروائی سے کہا اور بولا" یار، یہ لڑکیاں بھی عجیب بادشاہ ہوتی ہیں کہ "وقتے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت دہند" ــــ لیکن ، یار ، اب مجھے دیر ہو رہی ہے ۔ میں شام کو آؤں گا ۔ پانچ چھ بجے میرا انتظار کرنا۔"

وُہ چلا گیا تو میں نے سائیکل کا تالا کھولتے ہوئے سوچا" سٹرپٹو مائی سین!

بادشاہ لڑکیاں! یہ کیا بات ہوئی؟!

زمان اور میں تین سال تک اکٹھے ایک ہی کالج اور ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہے تھے۔ تین سال کی اس چھوٹی سی مدت میں اُس نے مجھے کس کس طرح تنگ کیا میں بیان نہیں کر سکتا۔ ظالم کا ذہن اچھا تھا۔ امتحان کے قریب آ کر چند دن پڑھائی کرتا اور پاس ہو جاتا۔ مجھے شروع سے رٹنے کی عادت تھی۔ لنگر لنگوٹے کس کر آدھی آدھی رات تک رٹا لگایا کرتا۔ وہ اپنے بستر میں بیٹھے سگریٹ پیتے ہوئے مجھے اس طرح جپ کرتے دیکھ کر بہت ہنستا اور اونچے اونچے پشتو کے شعر گانے لگتا۔ بے حد ضدی اور سر پھرا قسم کا آدمی واقع ہوا تھا۔ جو بات جی میں آتی بلا سوچے سمجھے کہہ دیتا۔ تمیز کے نام سے بُہت چڑتا تھا۔ مانگنا اس کے مذہب میں حرام تھا۔ کسی بات پر مُنہ سے نہ نکل گئی تو اس کا ہاں میں تبدیل ہونا ممکنات میں سے نہ تھا۔ تاش کبھی شرط بدے بغیر نہ کھیلتا تھا اور جو ہارنے والے کے پاس پیسے نہ ہوئے تو یا اس کی کتابیں ضبط ہیں یا پتلون! اپنے پاس رقم نہیں تو کھیل میں شریک ہی نہ ہوتا تھا۔ سگریٹ سلگانے کو ماچس نہیں تو مجھ سے کبھی نہیں مانگی۔ مُنہ میں سگریٹ دبائے چوس رہا ہے اور سر ہلا رہا ہے۔ میں نے چائے کی دو پیالیاں بنا کر کہا "زمان بھائی، چائے پیو" تو اُس نے آئینہ میں اپنے مہاسے کو بلیڈ سے چھیلتے ہوئے کہا "نہیں"۔ میں نے کہا۔ "تھوڑی سی"۔ اس نے جواب دیا "بھئی نہیں"۔ میں نے پوچھا "بھئی نہیں کا کیا مطلب؟" جھلا کر بولا "بھئی نہیں کا مطلب کہ نہیں"۔ میں نے پوچھا "وجہ؟" بولا "نہیں"۔ میں نے پوچھا "نہیں کیا؟" کہنے لگا "نہیں جو ہوتی ہے کہ بس نہیں"۔

ایسے آدمی کے ساتھ تین سال گذارنے جہنم ہیں کہ نہیں! باکسنگ میں یونیورسٹی چمپئن شپ کا انعام ملا تو اس بات پر اڑ گیا کہ انعام دینے والے سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ اپنی ہمت سے کپ لیا ہے۔ ہاتھ کیوں ملاؤں۔ چنانچہ ایسے ہی کیا۔ انعام لے کر ہاتھ ملائے بغیر واپس آ گیا ——— ڈاکیے نے ایک بیرنگ خط لا کر کہا "دو آنے دیجیے"۔ اُس نے لفافہ دیکھے بغیر جواب دیا "خط واپس کر دو میں نہیں لیتا"۔ میں نے پوچھا تو بولا "دو آنے نہیں"۔ میں نے کہا "یار مجھ سے لے لو۔ پھر لوٹا دینا"۔ پوچھنے لگا "کیوں لوں؟" میں نے کہا "اس لیے کہ خط لے

سکو۔" بولا "میں نہیں لیتا۔" میں نے نہیں کا لفظ سُن کر کہا "ٹھیک ہے۔ شیر دل کے پسر شیر ہی ہوتے ہیں جہاں ہیں۔ بھلا قبلہ گاہی کی طبیعت بھی ایسی ہی ہے؟" اس پر ہنسنے لگا تو میں نے شیر ہو کر کہا "تو بلاؤں ڈاکیے کو؟" اس نے نفی میں سر ہلایا اور تاش پھینٹنے لگا۔

کالج میں جب فیس داخل کرنے کا دن آتا تو دفتر ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ لڑکیاں اس دھکم پیل میں فیس دینے سے گھبراتی تھیں اور ان کی فیسیں لڑکے جا کر داخل کرواتے تھے۔ اس طرح ایک مہینہ کے بعد ان سے کھل کر گفتگو کرنے کا اچھا خاصا موقع مل جاتا تھا۔ وُہ اپنے پرس سے روپے نکالتیں اور گن کر کسی کلاس فیلو کو دے دیتیں۔ وُہ انھیں گنتا اور ضرور کہتا کہ ایک روپیہ کم ہے۔ اس طرح لڑکی اور لڑکے کے چہروں پر ایک ساتھ ایک سی مسکراہٹیں پھیل جاتیں۔ فیس ادا کر کے پھر انھیں حساب دیا جاتا۔ ایک آدھ آنہ یہ کہہ کر رکھ لیا جاتا کہ یہ ہماری سگرٹ کے لیے ہے اور پھر وُہ اکنّی کئی دنوں تک اس لڑکی کے سفید چھلّے کی طرح دکھائی دیتی رہتی۔ ہاسٹل میں کئی ایسے بامذاق لڑکے بھی تھے جن کے پاس بہت سی ایسی انگوٹھیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ہماری کلاس میں ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ کلاس کی نمبر سیما اُسے فیس لے جانے کے لیے منتخب کرے مگر وُہ صرف اسلم کے ہاتھ اپنی فیس دفتر بھجواتی ——— ایک مرتبہ اسلم نہیں تھا تو سیما نے زمان کو ستتر روپے دے کہا "میری فیس داخل کروا دیجیے۔" زمان نے کچھ کہے بغیر روپے لے لیے اور سیدھا ہوسٹل چلا آیا۔ سیما برآمدے میں گھنٹہ بھر تک رسید کا انتظار کرتی رہی مگر رسید لانے والا تو اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسرے دن زمان نے اکہتر روپے سیما کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ "کل مجھے نیند آ گئی اور میں فیس داخل نہ کروا سکا۔ آپ اپنے روپے لے لیجیے اور یہ ایک روپیہ لیٹ فیس کا جرمانہ ہے۔" سیما نے کھینچ کر روپیہ اُوپر سے دے مارا تو زمان نے کہا "ایسے تو نہیں ٹوٹے گا" اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کالج میں پروفیسر دلیس راج سے اُس کی جان جاتی تھی۔ یہ پُرانی وضع کے معمّر پروفیسر تھے۔ چست پاجامہ، اچکن پہنے ململ کی پگڑی باندھ کر کالج آتے۔

ایک ہاتھ میں بورڈ صاف کرنے کا ڈسٹر ہوتا اور دوسرے میں چاکوں کا ڈبہ۔ دونوں ہاتھ چاک کی سفیدی سے بھرے ہوتے اور اچکن پر بھی جگہ جگہ ان ہاتھوں کے نشان ہوتے۔ زمان کو وُہ "ہینگ والا" کہا کرتے تھے اور یہ انھیں بجائے پروفیسر صاحب کے باباجی کہا کرتا۔ باباجی کے سامنے اُس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا، اونچے نہیں بولا، ضد نہیں کی اور کسی بات سے انکار نہیں کیا۔

ڈائی ٹیکس کی کاپیاں دیکھتے ہوئے وُہ زمان کو بلاتے اور اس کا کان پکڑ کر آہستہ آہستہ مسلتے جاتے اور کہتے "یہ کیا کیا ہینگ والے، یہ کیا کیا؟" زمان کے مُنہ میں گھنگھنیاں بھری ہیں، آنکھیں نیچی ہیں، جواب دینے کی سکت نہیں اسی طرح کمان بنا کھڑا ہے۔ اگلا صفحہ پلٹ کر باباجی اس کا کان چھوڑ کر پیٹھ ٹھونکتے اور خوش ہو کر کہتے "میرا ہینگ والا ہے لائق۔ لیکن پاپی پڑھتا نہیں! اسکتے بازی پر جان دیتا ہے۔" پھر اس کی کاپی بند کر کے کہتے "جا، میرے لیے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا۔" اور زمان فخر سے سر اونچا کر کے دروازے کی طرف یوں بڑھتا جیسے کسی نے دوجہان کی بادشاہی اُسے بخش دی ہو۔

ایک مرتبہ سیما اور ساوتری پتہ نہیں کونسی کتاب لائبریری سے لینے گئیں بریرین نے انھیں بتایا کہ وُہ کتاب تو دیر سے زمان صاحب کے پاس ہے۔ ہبدھی ہوسٹل پہنچیں۔ میں رٹا لگانے میں مصروف تھا اور زمان حسبِ معمول ئی کو چوڑائی کے رُخ اوڑھے یُونہی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ سیما نے اندر آ کر ما "زمان صاحب وُہ کتاب آپکے پاس ہے؟"

زمان نے آنکھیں کھول کر جواب دیا "اس میز پر پڑی ہے۔" اور پھر کروٹ بدل کر دیوار کی طرف مُنہ کر لیا۔ میں اپنی چارپائی سے اُٹھ کر ان کے ساتھ کتاب تلاش کرنے لگا لیکن وُہ نہ ملی۔ سیما نے پھر کہا "مسٹر زمان، کتاب یہاں تو نہیں۔"

زمان نے اسی طرح لیٹے لیٹے جواب دیا "یہیں کہیں ہو گی۔ پرسوں تو سی میز پر پڑی تھی۔"

سیما اور ساوتری نے اس بدتمیزی پر احتجاجاً تلاش بند کر دی اور مُنہ پھلائے چلی گئیں۔

میں نے کہا "یار، عجیب احمق ہو۔۔۔۔"

اُس نے کہا "ہوں" اور پھر سو گیا۔

ایک مرتبہ جب کالج ہال میں ڈرامے کی ریہرسل ہو رہی تھی تو زمان بھی وہاں پہنچ گیا۔ سیما پانی کے جگ کے پاس کھڑی تھی۔ سلیم اپنا مکالمہ بول کر پانی سے حلق تر کرنے آیا تو سیما نے گلاس پر ہاتھ رکھ کر کہا "اُوں ہُوں! باہر نل پر جا کر پانی پیجیے۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لوگ اس ایک ہی گلاس میں پانی پیتے گئے ہیں" تو سلیم اس کی ہمدردی سے بہت مرعوب ہوا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کر کے باہر نکل گیا۔ زمان نے کہا "مجھے بھی پیاس لگی ہے" اور سیما نے پھر گلاس پر ہاتھ رکھ کر یہی کہا تو زمان نے گلاس اس کے ہاتھ سے کھینچ کر جگ سے پانی انڈیلا اور غٹ غٹ پی گیا۔ سیما نے کہا "ضدی کہیں کا"

زمان نے کہا "وہمی کہیں کی!" اور ایک مصنوعی ڈکار لے کر ہال سے باہر آ گیا۔

وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں باکسنگ کا مقابلہ ہوا۔ ہمارے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے طلبا بھی یہ مقابلہ دیکھنے آئے۔ زمان کا مقابلہ پنجاب رجمنٹ کے ایک کپتان سے ہوا اور زمان ہار گیا۔ رنگ سے باہر نکل کر اُس نے سیما اور سلیم کو آپس میں باتیں کرتے دیکھا۔ ان کے قریب جا کر زمان نے سیما سے پوچھا۔

"مقابلہ پسند آیا؟"

"بہت!" سیما نے مسکرا کر کہا "اچھا ہی ہوا۔ آپ کا مان بھی ٹوٹا۔ اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا جو لوئی سمجھے ہوئے تھے"

زمان نے شرارت سے مسکرا کر کہا "مان ٹوٹا! میں کوئی ہارا ہوں؟" پھر اُس نے اپنے خون آلود منہ اور چہرے پر پڑے ہوئے نیلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تمغے کامیابی کے بغیر تو نہیں ملتے نا، سلیم صاحب" سلیم کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور وہ سیما کو لے کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُتر گیا۔

سردیوں کی ایک تیرہ و تار رات کو بارہ بجے کے قریب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے سر اور بازو پر پٹیاں بندھی تھیں اور ان سے خون رس رہا تھا۔ بتی جلنے سے میں جاگ اٹھا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے رضائی پرے پھینک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں یار۔" اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر مُنہ میں دبائی اور ماچس میز پر پہلو کے بل کھڑی کر کے دائیں ہاتھ سے اس پر دیا سلائی رگڑنے لگا۔ میں نے کہا "میں جلائے دیتا ہوں" تو اس نے جھلاّ کر کہا "آخر کیوں؟ میں اپنی سگرٹ بھی خود نہیں سُلگا سکتا؟"

میں نے پھر پوچھا "تم زخمی کیسے ہو گئے؟" تو اس نے ہنس کر کہا "جیسے ہُوا کرتے ہیں ـــــ میں حملے کے جواب کے لیے تیار نہ تھا۔ وُہ مجھ پر ایک دم پل پڑا اور چاقو سے کھچاک کھچاک کئی زخم لگا دیے ـــــ پھر میں پٹی کروانے ہسپتال چلا گیا۔ اسی لیے تو مجھے دیر ہو گئی اور یار آج دیر سے آنے پر جواب طلبی بھی ہو گی اور جرمانہ بھی۔"

میں نے پوچھا "مگر وُہ تھا کون؟"

"مجھے کیا خبر۔" اُس نے بستر میں لیٹتے ہوئے کہا "ایسی تاریک رات میں کہیں شکل پہچانی جاتی ہے۔"

"وُہ کچھ بولا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بولا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"میں نہیں بتاتا۔"

میں نے گالی دے کر کہا "تو جا جہنم میں۔ تجھ سے پوچھتا ہی کون ہے۔"

اس پر وُہ ہنسنے لگا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دیر تک ہنستا رہا۔ بتی بُجھا کر اور اپنے بستر میں مُنہ سر لپیٹ کر میں جی ہی جی میں اُسے گالیاں دیتا رہا۔ پھر میں نے رضائی سے مُنہ نکال کر پوچھا "یار، تم نے اس کی آواز بھی نہیں پہچانی؟"

اس نے جھلاّ کر کہا "چاچا! میں نے پہلے کبھی اُس کی آواز سُنی ہوتی تو پہچانتا۔"

پھر ہم میں سے کوئی نہ بولا۔

جب دوسرے دن کالج میں ہر ایک نے بار بار اس سے رات کے حادثہ کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو اُس نے تنگ آ کر نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا دیا کہ پچھلی رات کسی شخص نے مجھے چاقو سے گھائل کیا۔ میں مقابلہ کے لیے تیار نہ

تھا اس لیے گہرے زخم آئے۔ پٹی اسی وقت کرالی گئی۔ اب رُوبصحت ہوں۔ براہِ کرم کوئی صاحب میری روداد نہ پوچھیں۔ میں اپنی داستان سُنا سُنا کر تھک گیا ہوں" اور اس کے نیچے اُس نے موٹے حروف میں زمان خان بقلم خود لکھ دیا۔

اسی شام میں اُسے سائیکل پر بٹھا کر پٹی کروانے ہسپتال لے جا رہا تھا کہ راستہ میں سیما مل گئی۔ اُس نے ہمیں روک لیا اور زمان سے کہنے لگی "مسٹر زمان، میں نے آج آپ کو پٹی باندھے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن اس کے متعلق پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کالج سے گھر لوٹتے ہوئے آپ کا اعلان پڑھا تو میرا جی بھی آپ کو ٹھیک دینے کو چاہا ——— بتائیے کیا ہوا تھا؟"

زمان نے سائیکل کی گدی پر ٹیک لگا کر کہا "کوئی گیارہ بجے کے قریب جب میں اپنے کالج کے پچھواڑے آموں والی سڑک پر جا رہا تھا تو کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں رُک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ متوسط قد کا ایک آدمی کمبل پہنے میرے پاس آیا۔ ذرا سی دیر کو رُکا اور پھر ایک دم خنجر سے مجھ پر وار کیا جو میرے بائیں کندھے میں لگا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو ہٹ کیا۔ مگر چونکہ میرا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ اس لیے ضرب ٹھیک سے نہیں لگی۔ اس نے مجھے نیچے گرا لیا اور پوچھا "تم سیما سے محبت کرتے ہو؟" میں نے کہا "ہاں"۔

سیما نے تنک کر پوچھا "آپ نے یہ کیوں کہا؟"

"وُہ اس لیے" زمان نے گھنٹی پر انگلی بجاتے ہوئے کہا "کہ اگر میں 'نہیں' کہہ دیتا تو وُہ مجھے چھوڑ دیتا اور سمجھتا کہ میں نے صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا

ہے۔ پھر اُس نے خنجر اُوپر اٹھا کر کہا "اس کا خیال چھوڑ دو۔ نہیں تو تمھیں جان سے مار ڈالوں گا"۔ میں نے جواب دیا کہ میں جان سے جائے بغیر اس کا خیال کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ کہتے ہی میں نے پوری طاقت سے اُسے پرے دھکیلا اور وُہ دُور جا گرا۔ سامنے کے چوبارے کی بتی جلی اور وُہ بھاگ گیا۔

سیما اس کا جواب دیے بغیر تیز تیز آنکھوں سے اُسے گھورتی آگے چلی گئی۔

راستے میں میں نے اُس سے پوچھا "تم نے یہ بات مجھے کیوں نہ بتائی" تو اُس نے جواب دیا کہ چونکہ اُس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے۔

اس واقعہ کے تھوڑے عرصہ بعد مارچ کے مہینے میں جب ہم لوگ اپنے

کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر اندر ہی سوتے تھے ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ آدھی رات کو کسی نے ہمارے کمرے کے دروازے سے لگ کر سوتے ہوئے زمان پر پستول سے دو فائر کیے۔ ٹیبل لیمپ کا شیڈ ٹوٹ گیا اور میز پر پڑی ہوئی آکسفورڈ ڈکشنری کے بہت سے اوراق گولی چاٹ کر نکل گئی۔

چند دن بعد زمان ہوسٹل سے چلا گیا۔ پھر اس نے کالج آنا بند کر دیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر پتہ نہیں کہاں چلا گیا اور آج پورے بارہ سال بعد اسی زمان نے کافی ہاؤس کی سیڑھیوں کے نیچے میری آنکھیں ہاتھ سے ڈھانپ کر گویا پوچھا تھا

"میں کون ہوں؟"

بہار ہوٹل میں میں دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ سات بج گئے مگر وہ نہ آیا۔ میں اپنے کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ ہوٹل کے پھاٹک پر زمان ایک بیرے سے میرا پتہ پوچھ رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

گھنٹی بجا کر میں نے بیرے کو بلایا اور زمان سے پوچھا "چائے پیو گے؟"

"نہیں" اس نے منہ پھاڑ کر جواب دیا۔

"آخر کیوں؟"

"بس نہیں"

جب اس نے "بس نہیں" کہا تو میں نے بیرے سے کہا "جاؤ کوئی کام نہیں"

میں نے زمان کے قریب کرسی کھینچ کر اسے پھر وہی خبر سنائی کہ اس کے چلے جانے کے بعد سماجی کہیں روپوش ہو گئی اور آج تک اس کا کوئی کھوج نہ مل سکا۔

"لیکن وہ گئی کہاں یار؟" اس نے حیرت سے پوچھا "اس کے ماں باپ نے تلاش بھی نہ کی؟"

"کی جائی۔ بہت کی مگر اس کا پتہ ہی نہ چلا"

"کمال ہے" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک بیڑی نکالی اور چوسنے لگا۔ پھر میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا "جس رات مجھ پر کسی نے

گولی چلائی۔ اُس سے اگلے دن سیما مجھے لائبریری میں ملی۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں شام کو اُسے آرام باغ میں ملوں۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے اتنا کہا کہ شام کو بتاؤں گی۔ شام کو ہم کرکٹ گراؤنڈ سے پرے درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ سیما نے کہا "زمان! اگر میں تم سے ایک چیز مانگوں تو دو گے؟" میرے مُنہ سے پتہ نہیں کیوں "ضرور" نکل گیا۔ اس نے روہانسی ہو کر کہا "مجھے اپنی زندگی دے دیجیے۔" میں نے بازو پھیلا کر جواب دیا "لے لو" تو اس نے کہا "میں اسے لے جا کر جہاں چاہوں رکھوں؟" میں نے کہا "جو چیز تمھاری ہے اس کے رکھ رکھاؤ میں دخل دینے والا میں کون؟" پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ ہاتھ باندھ کر بولی "یہاں سے چلے جائیے۔ اپنے گاؤں یا کہیں اور۔ وہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے..... آپ کو..... آپ کو....." پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں نے کہا "یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ میرے حملہ آور سمجھیں گے میں ڈر کر بھاگ گیا ہوں۔ میرے دوست کہیں گے میں بزدل تھا اور باکسنگ میں مجھ سے ہارے ہوئے میرے حریف کہیں گے وہ اب ہوتا تو... میں یہاں سے نہیں جاؤں گا سیما، خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جائے۔ تم مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو۔" اس نے کہا "تم نے وعدہ کیا تھا اور میں نے اس کی شہ پر اتنی سی چیز کی فرمائش کی ہے۔ اب تم اس چیز پر اپنے وعدے کو قربان کر رہے ہو۔ میں نے تو سنا تھا کہ تمھارے وعدے کبھی نہیں ٹوٹتے۔" —— میں نے سیما سے وعدہ کر لیا تھا کہ اپنے گاؤں تو نہ جاؤں گا پر بمبئی چلا جاؤں گا۔ وہاں میری برادری کے چند افراد سُودی روپئے کا لین دین کرتے تھے اور میں انھیں بتائے بغیر ان کے پاس پہنچ گیا۔ دن رات مجھے ایک ہی خیال کھائے جا رہا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ موت سی چیز سے ڈر کر بھاگ گیا۔ میں نے سیما کو ایک خط لکھا کہ بمبئی کی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں اور واپس آنا چاہتا ہوں۔ اب مجھے اپنے وعدے کا ذرا بھی پاس نہیں۔ اگر زندگی میں ایک وعدہ ایفا نہ ہو سکا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔ میں تمھارے خط کا ایک ہفتہ تک انتظار کروں گا اور اس کے بعد میں پھر تمھارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ چار دن گذر گئے خط نہ آنا تھا نہ آیا۔ پانچویں دن سیما میرے پاس پہنچ گئی۔ اس نے مجھے کالج کی کتنی ہی دلچسپ خبریں سنائیں۔ تمھارے متعلق بتایا کہ تم نے

ایک نیولا پال لیا ہے اور اُسے چھپا کر کلاس میں لے آتے ہو۔ باباجی کے بارے میں بتایا کہ میرا نام لے کر بار بار کہتے ہیں کہ وُہ پاپی بہت یاد آتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ خدا جانے ہم کو بھی یاد کرتا ہے یا نہیں —— پھر سمجھانے کہا کہ میں اس لیے آئی ہوں کہ تم اپنا وعدہ نبھا سکو۔ اب میں عمر بھر تمھارے ساتھ رہوں گی اور تمھیں اپنے قول پر قائم رکھوں گی۔

مجھے کسٹم میں ایک معمولی سی نوکری مل گئی اور بھنڈی بازار کی اسی کھولی میں ہماری شادی ہو گئی۔ لیکن یار وُہ کبھی کبھی سی رہتی اور جب میں دفتر ہوتا تو روتی بھی رہتی۔ شام کو اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی ہوتیں اور وہ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹیں پھیلا پھیلا کر مجھ سے باتیں کرتی۔ پھر ایک دن پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا کہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ بمبئی چھوڑ کر کہیں اور دُور نکل چلو۔ یُوں تو یار میں رات کو اس کے ساتھ تاش کھیل کر اُس کے سارے روپے جیت لیا کرتا تھا اور کبھی واپس نہ کرتا تھا پر مجھے اس کے دل کا بڑا خیال تھا۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں مستریوں کی جگہ خالی تھی۔ میں نے عرضی دے دی۔ انتخاب ہُوا اور ہم آبادان پہنچ گئے اور یار اب آبادان کی باتیں سناؤں گا تو رات بیت جائے گی مگر کہانی ختم نہ ہو گی —— وہاں باکسنگ اور ڈائی ٹیکس نے بڑا کام دیا۔ مائیکل صاحب ہر مہینے باکسنگ کا ایک مقابلہ کراتے اور میری گیم ضرور دیکھتے۔ ایک سال کے اندر اندر میں ڈپٹی انجینئر ہو گیا۔ سیما کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس نے ساری ہندوستانی اخباریں اور رسالے اپنے نام جاری کرا رکھے تھے۔ اپنے بنگلہ کے باغیچے میں بید کی کرسی ڈال کر دیر تک مطالعہ کرتی رہتی۔ مستریوں اور افسروں کی بیویاں اور بچے اس کے گرد گھیرا ڈالے اسے طرح طرح کی باتیں سنایا کرتے۔

اس دوران میں ہم نے شاید ہی کوئی فلم چھوڑا ہو۔ ہر روز سینما کا چکر ہو جاتا تھا۔ کبھی کبھار ہم ناراض بھی ہو جاتے تھے لیکن ہر بار میں ہی اُسے مناتا۔ وہ اپنے ابا اور امی کو یاد کر کے بہت رویا کرتی تھی۔ مجھ سے یہ بات پتہ نہیں کیوں برداشت نہ ہوتی اور یہیں سے جھگڑا شروع ہو جاتا۔ آبادان کی زندگی میں صرف ایک بار اُس نے مجھے منایا اور وُہ بھی غیر ارادی طور پر۔ تمھاری تصویر اخباروں میں چھپی تھی۔ وُہ اس کی نظر بھی پڑی۔ میں اُس وقت ریفائنری کے ایک ہزار فٹ

اُدھر نیچے کولنگ ٹینک پر بیٹھا سرکٹ دیکھ رہا تھا کہ سیما ٹرالی پر چڑھ کر اوپر میرے پاس پہنچ گئی۔ میں اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وُہ ان دنوں میرے ساتھ رہتی ہوئی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ وُہ بنگلہ سے ری فائنری اور پھر فرش سے اتنی اونچی چوٹی پر چڑھ آئی تھی۔ اخبار میری طرف بڑھا کر اُس نے تمہاری تصویر دکھائی اور کچھ نہ بولی۔ میں سرکٹ کا معائنہ مستریوں پر چھوڑ کر ٹرالی میں اس کے ساتھ سوار ہو گیا۔ ٹرالی آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگی۔ میں جنگلے کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا تو اُس نے میری آستین پکڑ کر کھینچی۔ میں کچھ بولا نہیں۔ پھر اُس نے میری کلائی پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا اور بولی "یہاں نہ بیٹھو۔" میں نے کہا "تم جو مجھ سے بولنا ہی نہیں چاہتی ہو یہاں سے کیوں اُٹھاتی ہو؟" اس نے میری دونوں کلائیاں پکڑ کر اپنی طرف کھینچیں اور میرے ساتھ چمٹ کر بولی "تم سے نہ بولوں گی اور کس کے ساتھ بولوں گی۔" ٹرالی زمین پر پہنچ گئی اور سارے مستریوں اور مزدوروں سے بے خبر وُہ مجھ سے اسی طرح چمٹی رہی۔

ہماری شادی کے پورے چھ سال بعد سہیل پیدا ہوا اور سیما کا اس سے دل لگ گیا۔ اس کے بعد شاید ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور بار میں نے

تم سے کہا نا کہ یہ لڑکیاں بھی عجیب بادشاہ ہوتی ہیں——"

میں نے پوچھا "سیما اب کہاں ہے؟"

زمان نے جواب دیا "پچھلے سال دسمبر کی ایک شام سہیل اپنے کونونٹ سے ڈراما دیکھ کر آیا تو راستہ میں اُسے بڑی سردی لگی۔ گھر آ کر اُس نے اپنی ممی سے کہا۔ کہ مجھے گرم دُودھ پلاؤ تو اس نے یہ سوچ کر کہ باورچی دیر لگائے گا خود ہی ایک پیالہ میں دُودھ ڈال کر اُسے اپنے ہیٹر پر رکھ کر پلگ جو لگایا تو اُسے شدید برقی صدمہ پہنچا۔ رات گئے تک سارے ڈاکٹر اس کے گرد جمع رہے لیکن وُہ جانبر نہ ہو سکی۔ سہیل کو اپنی ممی کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ وُہ اسی دن سے بیمار ہے۔ سیما کی موت کے بعد مجھے اپنے معاہدے کے مطابق ایک سال اور وہیں رہنا پڑا اور اس عرصہ میں سہیل کی حالت بد سے بدتر ہو گئی اور سچی بات تو یہ ہے کہ سیما کے بعد میں اس پر پوری توجہ بھی نہ دے سکا۔ اس دوران میں خوب جی بھر کر برج کھیلی اور سیما کا جمع کیا ہوا روپیہ ہارتا رہا—— اور اب مجھے

یہاں آئے پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔ سہیل کی حالت اب بالکل بگڑ چکی ہے ڈاکٹر نے سٹرپٹومائیسین کے ٹیکے تجویز کیے ہیں اور آج دوپہر میں اسی کا پرمٹ لینے جا رہا تھا کہ تم مل گئے۔"

میں نے پوچھا "پرمٹ مل گیا؟"

"ہاں۔" اس نے اپنے کرتے کی بغلی جیب میں ہاتھ ڈال کر خاکی رنگ کا ایک کاغذ نکال کر دکھایا اور بولا "اب تو دکانیں بند ہو گئی ہوں گی۔ صبح ٹیکے خریدوں گا۔"

میں نے کہا "الفنسٹن سٹریٹ میں ابھی بہت سی دکانیں کھلی ہوں گی۔ ابھی چل کر کیوں نہ لے لیں۔"

زمان نے کہا "اب کل ہی لوں گا۔"

"کل کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بس یار آج نہیں لوں گا۔"

"نہیں کیوں؟"

"نہیں لوں گا، یار، کیوں کیا؟"

"پیسے نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہیں۔" اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"دکھاؤ۔"

"نہیں دکھاتا۔"

میں نے کہا "اچھا تمھاری مرضی۔ یہ کوئی نئی نو بات نہیں تم ہمیشہ سے ایسے ہی ضدی اور اپنی ہٹ کے پکے رہے ہو۔ بچے کی جان کے لالے پڑے ہیں اور تم اپنی وضعداری نبھا رہے ہو۔"

اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بولا "اچھا اب چلتا ہوں۔ کل تم سے ملوں گا دس گیارہ بجے کے قریب۔"

وہ چلا گیا تو میں نے اپنے بٹوے سے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور پڑیا بنا کر مٹھی میں چھپا لیا۔ پھر میں تیزی سے اس کے پیچھے گیا وہ ہوٹل کے پھاٹک کے پاس ایک دیا سلائی خرید رہا تھا۔

میں نے کہا "ظالم، اتنی لمبی رات درمیان میں ہے۔ گلے تو مل لو" جب وُہ مجھ سے بغلگیر ہوُا تو میں نے سو روپے کا نوٹ چپکے سے اس کی بغلی جیب میں ڈال دیا۔ تھوڑی دُور اس کے ساتھ چل کر میں واپس اپنے ہوٹل میں آگیا اور بیرے سے کہا کہ اگر کوئی صاحب مجھ سے ملنے آئیں تو انھیں کہہ دینا کہ میں یہ ہوٹل چھوڑ کر چلا گیا ہوں —— اور دیکھو صبح سات بجے ایک وکٹوریہ لا کر مجھے جگا دینا۔ میں صبح کی گاڑی سے واپس جا رہا ہوں"۔

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ زمان کے نام ایک خط لکھا اور اسے میز پر ڈال کر سو گیا۔

صبح سات بجے بیرے نے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا "جاگ گیا ہوں بھئی، تم جاؤ"۔

مگر بیرے نے شاید میری آواز نہیں سُنی۔ اسی طرح دروازہ پیٹے گیا۔ جھلا کر میں بستر سے اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے زمان کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اُس نے ہنس کر کہا "یار عجیب گھوڑے بیچ کر سوتے ہو۔ اس عمر میں ایسی نیند اچھی نہیں ہوتی۔ بھلے مانس صبح اُٹھ کر اللہ کا نام لیا کرو"۔

میں نے خفّت مٹاتے ہوئے کہا "بھائی رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ اسی لیے آج دیر سے اُٹھا ہُوں۔ ورنہ اب تو میں کالج کا وُہ لونڈا نہیں رہا"۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ سے بیڑی لے کر یونہی ایک دو کش لگائے اور پوچھا "سہیل کیسا ہے؟"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "یار، وُہ بھی اپنی ممی سے جا ملا"۔ پھر اُس نے اپنے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دامن اُلٹ کر کہا۔

"یار، ذرا دیکھنا۔ کل رات یہاں سے جاتے ہوئے کسی صاحبزادے نے ہماری جیب کاٹ لی۔ جیسے ہم جیبوں میں نوٹ ہی نوٹ ڈالے پھرتے ہیں۔ سالے کو سٹر پٹو مائی سین کے پرمٹ اور تین آنے کے سوا اور کیا ملا ہوگا"۔

کٹی ہوئی جیب سے اس کی زرد زرد انگلیاں چھپکلیوں کے سروں کی طرح باہر جھانک رہی تھیں۔

بندرابن کی کنج گلی میں

میں آپ کو افسانہ پھر کبھی سناؤں گا۔ آج مجھے ایک راز افشا کرنے دیجیے۔ ایسا راز جو پتہ نہیں کب سے میرے سینے میں کھٹک رہا ہے اور مجھے بے چین کیے دیتا ہے۔ شاید اس میں آپ کو اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آئے لیکن میں کیا کروں، مجھے بھی تو دل سے ایک کھٹک نکال کر آرام سے زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے۔

جب میں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تو چاچا نے کہا "کمیٹی کی نوکری کر دو۔ ساری برادری میں شان ہو جائے گی۔" مگر میں نہ مانا اور اُسے بتائے بغیر کالج میں داخل ہو گیا۔ نمبر اچھے تھے۔ شکل و شباہت سے میں خاصا غریب دکھائی دیتا تھا۔ قمیص اور جوتوں کے پیوندوں نے میری سفارش کی اور میری فیس معاف ہو گئی۔ کتابوں کا خرچ چلانے کے لیے میں نے چاچا کے ساتھ دریا کمانا شروع کر دیا اور مجھے دن بھر کی کمائی میں سے دو آنے بلا ناغہ ملنے لگے۔ جس دن ہمارے اکھنڈے میں دو تین روہو بھی آ جاتے اس دن چاچا مجھے بنا مانگے چار آنے دے دیتا۔ پہلے پہل چاچا کی طرح ماں بھی میری پڑھائی کے خلاف تھی مگر جب اسے پتہ چلا کہ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے ڈگری کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت بنگلہ اور پیاری سی کار بھی مل جائے گی تو اس نے میری مخالفت چھوڑ دی اور میری لالٹین کی چمنی کو ہر روز اپنی اوڑھنی سے صاف کرنے لگی۔

.. مچھلیاں پکڑنے کے لیے میں رات گئے تک چاچا کا ساتھ نہ دے سکتا کیونکہ گھر آ کر مجھے پڑھنا ہوتا تھا۔ تین چار مرتبہ ٹاپا دریا میں پھینک کر جو کچھ بھی ہاتھ آتا میں اسے ٹوکری میں ڈال کر اپنی راہ لیتا۔ بابا فریدا کنارے پر حقے کی آگ بنا رہا ہوتا۔ مجھے چلنے کی تیاری میں مصروف پا کر بڑی محبت سے کہتا "نمدار بابا دو کش کھینچتا جا، تلونڈی کا تمباکو ہے۔ سورگ کے جھونٹے آئیں گے، بچو، سورگ

کے "لیکن میں ٹاپا کندھے پر ڈال کر کہتا "بابا دیر ہو رہی ہے " اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا اسٹنٹ ناپنے لگتا۔ پُل کے نیچے چاچا اور اس کے ساتھی چربیلا پانی میں ڈالے اندھا شکار کھیل رہے ہوتے اور پرے کنارے پر بابا کے حقے کے پھول دہک رہے ہوتے۔

ٹاپے کی لڑیوں سے سیسے کی گولیاں باندھتے ہوئے ماں یہ ضرور کہتی "تیرا چاچا تیرے سے چھوٹا ہوگا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ ہر روز اکیلا دریا کمانے جاتا تھا پر کیا مجال جو کبھی کوئی ٹوٹنے دی ہو۔ تو پڑھا لکھا ہے۔ پھر بھی جال کو اجڑا ہوا آ لتا بنا لاتا ہے "۔

میں لکھتے لکھتے جواب دیتا "بول نہ ماں۔ میں پڑھ رہا ہوں "

اور ماں خاموش ہو جاتی۔

چونکہ کالج میں ہر کوئی جانتا تھا کہ میں سجاول مچھیرے کا لڑکا بندا ہوں اسی لیے مجھے اپنی غریبی چھپانے کی چنداں ضرورت نہ ہوئی۔ میرا ہر ہم سبق بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کو دے دیا کرتا۔ دوپہر کا کھانا اکثر اوقات میں اپنے اُن دوستوں کے ساتھ ڈائننگ روم میں کھایا کرتا جو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اِن میں سے چند اتنے اچھے تھے کہ مجھ سے اس کھانے کی "قیمت" بھی لے لیا کرتے تھے مگر وُہ کچھ اتنی زیادہ نہ ہوتی تھی۔ مجھے ان کے لیے ایک آدھ جواب مضمون یا منطق کے دو چار سوالوں کا جواب لکھنا ہوتا تھا جو فوراً ہی لکھے جاتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی اپنے دوستوں سے ہیٹا نہ سمجھا۔ پر ایک تمنا ایسی بھی تھی جو کم بخت پھلنے پھولنے ہی میں نہ آتی تھی اور وُہ تھی شرارتوں میں شرکت کی آرزو۔ ہوسٹل اور کالج میں تمام اجتماعی اور انفرادی شرارتیں میرے بنائے ہوئے پلان کے مطابق ہوتی تھیں لیکن میں ان میں شرکت نہ کر سکتا تھا۔ ہر شرارت کے خاتمہ پر جرمانے ہوا کرتے اور مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ایک آدھ جرمانہ بھی برداشت کر سکوں۔

ہفتہ کی ایک شام جب میں نے ہوسٹل کے منچلے جوانوں کو رائے دی کہ آج آدھی رات کو پچھواڑے جو مالٹوں کا باغ ہے اُس پر چھاپہ مارو اور ایک مالٹا بھی شاخ پر نہ چھوڑو تو تجویز کثرت رائے سے پاس ہو گئی لیکن سب نے مجھے بھی اس شبخون

میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ میں نے حسبِ عادت وہی عذر پیش کیا تو نثار نے اسے یہ کہہ کر بے معنی قرار دے دیا کہ وہ میری جگہ بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہے۔ اس پر میں نے بھی ہامی بھر لی۔

میں کہنے کو تو ہاں کہہ آیا مگر راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ اگر کالج سے نکالے جانے کا جرمانہ ہوا تو؟ اس رات ایک بھی مچھلی نہ پھنسی حالانکہ پانی پر تیرتے ہوئے نرونڈے بار بار غوطے مار کر اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ بہت سی مچھلیاں آس پاس گھوم رہی ہیں۔ جال ایک طرف پھینک کر میں بابا فریدے کے پاس جا بیٹھا اور حقہ کے کش لینے لگا۔ اتنی دیر تک بابا مجھ سے پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا رہا مگر ایک کا جواب بھی ٹھیک سے نہیں دیا۔ میں برابر مالٹوں کے باغ پر چھاپے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ چھاپہ مارا جائے۔

"لیکن چھاپہ مارا کس وقت جائے؟" نثار نے پوچھا۔

"ایک بجے"۔ میں نے بڑی سُلگاتے ہوئے جواب دیا۔

ایک بج گیا اور ہم ایک ایک کر کے غسل خانہ کے پائپ کے ذریعے ہوسٹل سے باہر نکل گئے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ روشنی تقریباً دن جیسی تھی مگر اس میں گرمی کی جگہ خنکی اور سختی کی جگہ نرمی تھی۔ میں نے ساری پارٹی کو باغ کی کچی دیوار کی اوٹ میں چھپنے کو کہا اور خود ایک انداز سے دیوار پھاند کر باغ میں اتر گیا۔ چاروں گوشوں کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک مالٹا توڑ کر چکھنا بھی چاہا کہ سامنے سے ایک نسوانی آواز آئی "کون ہے؟"

"میں ہوں"۔ میں نے کہا۔

"میں کون؟" اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"میں جو ہوتا ہے"۔

"اچھا"۔ وہ اور آگے بڑھی اور بولی "یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

"مالٹے توڑنے"۔

"بازار سے لے کر کیوں نہیں کھاتے۔ تمہارے باپ کا باغ ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "بازار میں تو ٹوٹے سٹائے ملتے ہیں اور یہاں۔۔۔۔"
اس نے زمین سے مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا اُٹھا لیا اور سینہ تان کر بولی "لو توڑ دو ماسٹے"
میں نے اس کے جواب میں جیب سے ایک بیڑی نکالی اور اسے دیا سلائی دکھا کر کہا "اچھا نہیں توڑتے" اور جب میں واپس مڑا تو اس نے ڈھیلا زمین پر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد باغ میں غل مچا۔ سیٹیاں گونجیں۔ کتنے جھونکے اور سارے پودے دس منٹ کے اندر اندر مالٹوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر شاخوں کے سر اوپر اُٹھا کر چاندنی کا نظارہ کرنے لگے۔ اس دوران میں مجھے کچی دیوار کے اس طرف اس لڑکی اور اس کے ماں باپ کی گالیاں اور کوسنے سنائی دیتے رہے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔
ساٹھ پینسٹھ لڑکوں میں سے ایک آدھ کو تو چغلی کھانی ہی تھی۔ نذیر نے مجھے اس فتنہ کا سرغنہ قرار دے کر پرنسپل کو رات کے ڈاکے کا سارا حال بتا دیا۔ میری پیشی ہوئی اور میں صاف مکر گیا بلکہ میں نے یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ پچھلی رات میں ہوسٹل میں تھا۔ پرنسپل نے ہوسٹل کے تمام لڑکوں کو اکٹھا کر کے مجھ سے کہا کہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ کل رات تم یہاں تھے تو تمھیں کالج سے نکال دیا جائے گا۔ ایک دفعہ جھوٹ بول لیا تھا۔ اب سچائی کی سرحدیں بہت دُور معلوم ہوتی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے سچائی افق کے پاس رہتی ہے اور میں جوں جوں اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کروں گا وہ دور ہوتی جائے گی۔ اس لیے ایک مرتبہ پھر جھوٹ بولنا پڑا۔
دوسرے دن پہلے ہی پیریڈ میں چپڑاسی پرنسپل صاحب کا بلاوا لے کر آ گیا۔ دفتر کے سامنے ساری پارٹی جمع تھی۔ اندر باغ کا مالی اور اس کی لڑکی اُونچے اونچے بول رہے تھے۔ ایک ایک کو اندر بلایا جاتا اور اس کی شناخت کروائی جاتی۔ میری باری آئی اور میں اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں خوشی سے ناچ اٹھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ہاتھ باندھ کر کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میں بھی تمھاری ہی طرح ایک نادار آدمی ہوں اور اگر تم نے مجھے پہچان لیا تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔

لڑکی کے باپ نے پوچھا "یہی ہے وُہ لڑکا؟" تو لڑکی نے ایک آنکھ میچ کر اور پیشانی پر بہت سی شکنیں ڈال کر کہا "یہ تو نہیں۔ وُہ ٹھگی جو گا تو لمبا پتلا سینک سلائی سا تھا"

میرے حلق میں ایک چھوٹی سی خاردار جھاڑی اُگ پڑی۔ میں نے تشکر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ اُس نے بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور جیسے کہنے لگی "اس مرتبہ تو ہم نے تمھیں معاف کر دیا لیکن اگر پھر ایسی حرکت کرو گے تو یاد رکھنا"

ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد مجھے وظیفہ مل گیا اور مجھے بی۔ اے کرنے کے لیے لاہور آنا پڑا۔ کالج کی فیس وغیرہ ادا کر کے کل چھ روپے بچتے۔ پانچ روپے مہینہ چاچا بھیج دیتا تھا۔ خرچ تو خیر کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا لیکن سوٹ سلوانے اور سینما دیکھنے کو پیسے نہ بچتے تھے اور اب یہاں وُہ دوست بھی نہ تھے جو میری اعانت کرتے۔ چونکہ یہاں کسی کو میرا اصلی نام معلوم نہ تھا اور میں نامدار صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا اس لیے اور بھی مصیبت تھی۔ گرد و پیش نے مجھے اپنی مفلسی چھپانے اور بڑا بننے پر مجبور کر دیا تو میں نے دونوں باتوں کو اپنا لیا۔

شاہ عالمی کے باہر بانس کے ایک سوداگر میمن سیٹھ تھے۔ انھوں نے اردو خط و کتابت کے لیے مجھے پانچ روپیہ مہینہ پر نوکر رکھ لیا۔ شام کو ایک مرتبہ جانا ہوتا تھا اور چند خطوں کے جواب لکھنے پڑتے۔ پہلی تنخواہ پر گیارہ آنے کی ایک رنگ برنگی ریشمی ٹائی خریدی۔ ایک پرانا امریکن کوٹ لے کر اُسے اپنے جسم پر فٹ کروایا اور تنخواہ ختم ہو گئی۔ تھوڑے دنوں بعد کالج میں ایک مباحثہ ہوا اور مجھے دس روپیہ نقد انعام ملا۔ اگلے مہینے کی تنخواہ چار دن پہلے لے کر ایک پتلون بھی سلوائی۔ معزز آدمی تو بن گیا۔ لیکن یہ خدشہ جان کا لاگو ہو گیا کہ کسی دن چاچا سبز کنارے والی سفید دھوتی اور بغیر تسموں کے سیاہ بُوٹ پہن کر کالج نہ آ جائے۔

آنرز کی کلاس تھی۔ پروفیسر ابھی آیا نہ تھا اور ہم مستطیل میز کے اردگرد بیٹھے گپیں مار رہے تھے کہ کانتا نے پوچھا "پھولوں میں سے اچھا پھول کون سا ہے؟"

"گوبھی کا" میں نے ایک دم جواب دیا۔

سریندر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "بھئی ایسا غیر شاعرانہ جواب ادب کی کلاس میں!"

کانتا نے کہا "میرا مطلب ہے سب سے اچھی خوشبو والا پھول کونسا ہے"

میں نے جواب دیا "دو من چیل پرادن کا پھول"

کلثوم نے کاپی سے نگاہ اٹھا کر بڑی متانت سے مجھے دیکھا اور پھر اپنی کاپی پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں صبح بنارس کی سی نرمی تھی اور اس کے بال برسات کی اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو بے پروائی سے میز پر ڈالے پڑھ رہی تھی۔ انگلیاں بہت زیادہ لمبی نہ تھیں۔ جلد بہت زیادہ سفید نہ تھی۔ مگر میز پر رکھے ہوئے وہ ہاتھ حضرت مسیح کی عبا کی دو موتی موتی سوئیں معلوم ہوتے تھے۔ کلثوم اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اچھی لگی تھی مگر اب کی بار وہ صرف وہ اچھی ہی نہ لگی تھی بلکہ اپنے سے برتر بھی۔ میرا جی چاہا کہ ابن مریم کے دامن کو ایک بوسہ دے کر آنکھوں سے لگالوں مگر کلاس روم میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔

میری عادت تھی کہ تقریباً ہر پیریڈ میں کلاس سے باہر جا کر آدھا سگریٹ یا سالم بیڑی پیتا اور پھر دانتوں پر رومال رگڑ کر اپنی جگہ آبیٹھتا۔ ایسے ہی ایک دن میں برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ کلثوم میرے پاس آکر بولی "آپ اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ میرے پاس اتنے سگریٹ ہوتے ہیں اور اس لیے کہ فالتو سگریٹ بنک میں جمع نہیں کرائے جا سکتے"

وہ ذرا مسکرائی اور کہنے لگی "سگریٹ نوشی سے تو پھیپھڑے کالے ہو جاتے ہیں اور۔۔۔۔۔"

میں نے کہا "ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ انھیں کون دیکھنے جائے گا۔ شکر ہے کہ۔۔۔۔"

اس نے کہا "انگلیاں بھی تو کالی ہو جاتی ہیں"

"انگلیاں؟" میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنی انگلیاں دیکھیں "کالی تو خیر نہیں پیلی ضرور ہو جاتی ہیں"

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور لاپروائی سے لائبریری کی سیڑھیاں

چڑھنے لگی۔

وُہ کسی امیر آدمی کی بیٹی تھی۔ عنابی رنگ کی بڑی سی کار میں آتی۔ شوفر اس کی کتابیں اُٹھا کر کمرے تک پہنچانے آتا اور پلٹتے ہوئے ضرور سلام کرتا۔ اسے اپنے باپ کی دولت پر کچھ ایسا غرور نہ تھا۔ موٹر سے نکلتی تو کندھے سکوڑے ہُوئے یُوں گھٹی گھٹی چلتی جیسے کسی نے اس کے سر پر احسان کا پہاڑ دھر دیا ہو۔ سفید رنگ کی شلوار قمیص پہنے اور سر پر جارجٹ کا سبز دوپٹہ اوڑھے وُہ اسی طرح آتی جاتی رہی کالج کی گیلریوں میں وُہ اسی طرح کھوئی کھوئی چلتی جیسے وُہ بھُول کر یہاں آگئی ہُو، اصل اُسے کہیں اور جانا ہو۔

اب میں نے اُس کے سامنے سگرٹ پینے چھوڑ دیے تھے۔ جُونہی وُہ سامنے سے آتی دکھائی دیتی میں سگریٹ کو جلدی سے بجھا کر جیب میں ڈال لیتا اور دانتوں سے ناخن کاٹنے لگتا۔ وُہ میرے قریب سے گذرتی اور مجھے دیکھ کر آگے بڑھ جاتی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے یُوں لگتا جیسے اُونچے اُونچے گھنے درختوں کے جھنڈ میں صاف و شفاف پانی کے تال کے نیچے طلسماتی چراغ جل رہے ہوں۔ شاید انہی دیئوں کے آگے میرا سگریٹ روشن نہ رہ سکتا تھا!

ایک دن پتہ نہیں کیا ہُوا کہ وُہ نہ آئی اور میری حالت اس پن ڈُبے جیسی ہو گئی جو دن بھر غوطے مارنے کے بعد بھی کوئی مچھلی نہ پکڑ سکے اور شام کو خالی ٹوکری لے کر اپنے ڈیرے چلا جائے۔ دوسرے دن اس نے بتایا کہ وُہ اپنی ایک عزیز کی شادی میں اس درجہ مصروف رہی کہ کالج نہ آ سکی۔ میں نے کہا "اگر نہیں آنا تھا تو کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا تاکہ میں بھی نہ آتا۔"

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور بولی "میں تو کل بھی نہ آسکوں گی۔"

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے دن کالج نہ گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ وہ کل کالج آئی تھی۔ مگر ایک پیریڈ پڑھ کر چلی گئی۔

خاموشی کے ساتھ ساتھ اس کی طبیعت میں ڈر کا عنصر بھی تھا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو کانپ اُٹھتی۔ ہوا کے جھونکے سے فرش پر کاغذ کا پُرزہ سرسراتا تو وُہ دبک جاتی اور اگر کمرے کا دروازہ کھٹ سے بند ہوتا تو وُہ اپنی نشست پر اُچھل پڑتی۔ خوف سے اس کے چہرے پر کئی رنگ آتے اور کروٹیں بدل بدل کر پھیل جاتے۔ اُس کی دُبی آنکھیں

سپنوں کی طرح کھلا جاتیں اور اس کی سانس ورانیز ہو جاتی، میں نے اس سے کئی مرتبہ اس بارے میں پوچھا بھی مگر وُہ کوئی معقول جواب نہ دے سکی۔ بس یہی کہتی رہی کہ میں شروع ہی سے ڈرپوک ہوں۔

گھنٹی بج جاتی اور کوئی پروفیسر دیر تک نہ آتا تو کلثوم کہتی "پروفیسر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔"

تو میں فوراً کہہ اُٹھتا "وُہ تو فوت ہو گئے۔"

سب ہنس پڑتے اور اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا۔

اُس نے مجھے کئی مرتبہ ٹوکا تھا کہ یہ لفظ استعمال نہ کیا کروں مگر مجھے تو یہ لفظ کہنے اور اس کے ٹوکنے میں مزہ آتا تھا۔ سریندر کبھی غیر حاضر نہ ہُوا تھا مگر ایک دفعہ نہ جانے کیا ہُوا کہ اکٹھے پندرہ دن تک کالج نہ آیا اور جس دن وُہ آیا تو میں نے اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا "ہم تو سمجھتے تھے کہ جناب فوت ہو گئے مگر آپ تو چلے آ رہے ہیں" تو کلثوم نے کہا "یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ یوں نہ کہا کریں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا ایسی باتیں کرتے ہے"

میں نے ہنس کر جواب دیا "نہیں۔"

ایک دن اس کی کار اُسے لینے نہ آئی اور وُہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ میں نے کہا "آج تانگے میں چلی چلو۔ آخر غریب تانگے والے بھی تو آپ ایسے دھن بانوں سے آس لگائے گھوڑے جوتے پھرتے ہیں۔" اس نے میری بات مان لی اور ہم آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ راستہ میں اس نے ایک دم مرتبہ مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ آج اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔ وہی چمک جو صدیوں زمین کا پسینہ چاٹ چاٹ کر کوئلے میں پیدا ہو جاتی ہے۔

آخری مرتبہ اُس نے مجھے دیکھ کر کہا "مجھ سے رہا نہیں جاتا۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ بُرا مان جائیں گے۔" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا "اگر بُرا ماننے کی بات ہوئی تو البتہ مان جاؤں گا۔"

"میں نہیں کہتی۔" اُس نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے کہا "اچھا نہیں مانوں گا۔"

اُس نے کہنا شروع کیا، "میں چھوٹی سی تھی تو ہمارے قصبے میں بیساکھی کے میلہ پر ایک دفعہ سرکس بھی آیا۔ سرکس والے رات کو اپنے کرتب دکھاتے اور دن کو ایک چھوٹے سے خیمے میں اپنے جانوروں کے پنجرے جمع کر کے چڑیا گھر بنا لیتے جنھیں دیکھنے کا ٹکٹ ایک آنہ ہوتا تھا۔ ابّا جان مجھے بھی اس کی سیر کے لیے لے گئے۔ اس میں شیر تھے، بندر تھے، بڑے بڑے اژدہے اور چھوٹے چھوٹے نیولے تھے۔ ایک پنجرے میں بطوں جتنی ننھی منّی گائیں تھیں اور ان کے ارد گرد لومڑیاں، بھیڑیے، لگڑبگڑ اور گیدڑوں کے پنجرے بھی تھے۔ داخلے کے دروازے کے پاس ہی ایک بڑے سے بلّے کا پنجرہ تھا۔ مٹیالے رنگ کا دھاری دار باگڑ بلّا! اور سارے جانور یا تو زور زور سے چیختے رہتے یا اپنے پنجوں سے پنجروں کے دروازے کھڑکاتے رہتے مگر وہ بلّا پیال کے بستر پر آرام سے پڑا سویا کرتا۔ مجھے یاد ہے اس کے ناک کی پھننگ ہلکے گلابی رنگ کی تھی اور ہمیشہ نم آلود رہا کرتی۔ کبھی کبھار وہ انگڑائی لے کر اٹھتا سارے بدن کو تانتا اور پھر اپنی پوستین جھٹک کر کونے میں پڑا ہوا گوشت کھانے لگتا۔ اس کے بعد اپنے پنجرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ اس کی شکل و شباہت بڑی متین اور سنجیدہ قسم کی تھی۔ چکر کاٹتے ہوئے اس کے جسم کی دھاریاں ایک دوسری پر پلٹتی رہتی تھیں اور اس کی دُم بڑی سُستی سے اُس کے جسم کا ساتھ دیتی۔ چڑیا گھر ہمارے بنگلے سے کچھ ایسا دور نہ تھا۔ میں امّی جان کی تلے دانی سے چپکے سے ایک آنہ نکالتی اور وہاں پہنچ جاتی۔ کسی دوسرے جانور کی طرف توجہ دیے بغیر میں اس کے پنجرے کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور دیر تک اُسے دیکھتی رہتی۔ میرا جی چاہتا کہ ایک پتلی سی سینک لے کر اس کی ناک چھوؤں تاکہ اُسے ایک پیاری سی چھینک آ جائے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مجھے وہ اچھا بھی لگتا تھا اور اس سے خوف بھی آتا تھا اور ...... اور ...... اتنے برسوں کے بعد میں پھر جیسے اپنے بچپن میں پہنچ گئی ہوں۔ آپ مجھے وہی باگڑ بلّے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھے سے! بیبے سے!" وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ایک لمحہ کے لیے اپنے چہرے پر غصّہ کے بناوٹی آثار پیدا کر کے مصنوعی چھینک لی اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں نے کہا، "تم اپنی گفتگو میں پنجابی کے بہت سے الفاظ بولتی ہو کیا تھیں..."

اُس نے سر ذرا اونچا اُٹھا کر کہا، "مجھے اس زبان سے محبت ہے اور اسی کی

بدولت میں اپنی ایک نہایت عزیز سہیلی سے ہاتھ بھی دھو بیٹھی ہوں ——— کونونٹ میں ہمیں انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں بات کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن میرا جی اپنی سہیلیوں کو اٹیے کہنے کو ترستا تھا۔ راحت نے مجھے اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ میں اُسے علیحدگی میں "اٹیے راحت" کہہ کر پکار سکوں۔ ایک مرتبہ کامن روم میں کیرم کھیلتے ہوئے راحت نے اپنی گوٹ ہاتھ سے پاکٹ میں ڈال لی۔ میں نے دیکھ لیا اور بگڑ کر کہا "جا اٹیے، ہم نہیں تیرے ساتھ کھیلتے۔ تُو تو بے ایمانی کرتی ہے۔"

اس پر ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور راحت مجھ سے ناراض ہو گئی۔"

میں نے کہا "تم مجھے اٹیا کہہ لیا کرو۔"

وُہ یہ سُن کر گھبرا سی گئی اور پھر اسی طرح گردن جُھکا کر چلنے لگی۔

جب کلثوم دو ہفتے کی چھٹی ختم کر کے کراچی سے واپس آئی تو اُس نے آتے ہی پوچھا "میں جو اتنے دن کالج نہیں آئی تو آپ نے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں" میں نے جواب دیا۔

"کچھ تو کہا ہو گا؟"

"ہاں" میں نے ذرا سوچ کر کہا "جب پروفیسر نے پوچھا تھا کہ کلثوم نہیں آئیں تو میں نے ہولے سے کہا تھا۔ وُہ تو فوت ہو گئیں۔"

کلثوم نے کہا "اور اگر میں سچ مُچ مر جاتی تو آپ کو افسوس ہوتا نا؟"

میں نے کہا "یہ تو ایک محاورہ ہے اور تم محاورے کو لغوی معنی پہناتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔"

اس نے نہ جانے کیوں بُرا مان کر کہا "آپ کے لیے تو میں کبھی کی مر چکی ہوں۔"

میں گھبرا گیا۔ میرے نزدیک فوت ہو جانا ایک اور بات ہے اور مر جانا کچھ اور۔ اس نے ان دونوں کو گڈمڈ کر دیا تھا حالانکہ دونوں میں بڑا فرق تھا۔

کراچی کی سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے اُس نے کہا "ایک دن ہم ہاکس بے گئے تھے۔ اس کے قریب ہی لنباڑا ماہی گیروں کی ایک بستی ہے۔ مچھیرے بڑے بڑے جال پانی میں ڈال کر اُونچے اُونچے گیت گاتے ہیں۔ ان کی عورتیں اپنی جھونپڑیوں کے آگے بیٹھ کر جالوں کی مرمت کیا کرتی ہیں۔ موتیوں ایسے دانتوں والی سیاہ فام خوبصورت لنباڑنیں۔ میں نے ان کے بہت سے فوٹو اتارے۔ انھوں نے مجھے

ناریل کے پتّوں کی ٹوکریوں میں تازہ تازہ مچھلیاں تحفہ کے طور پر دیں۔ ان میں بہت سی میری سہیلیاں بن گئیں مگر ہمارا ان کا کیا ساتھ! ان میں خلوص ہے۔ مروّت ہے اور ہم! ہم!" اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولی "لیکن آپ میں ایک طرح کا خلوص ہے۔ مروّت کی باس ہے۔ وہی مروّت جو صرف ان کے یہاں مل سکتی ہے۔"

میں سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے وُہ کہہ رہی ہو۔ آپ میں بھی مچھلی کی باس ہے۔ ویسی ہی باس جو لنباڑنوں سے آیا کرتی ہے۔ دل کے چور نے کہا۔ اسے پتہ لگ گیا کہ تم سجاول مچھیرے کے لڑکے نندارا ہو۔ میرے گلے میں مچھلی کا کانٹا اٹک گیا اور میں نگاہیں زمین پر گاڑ کر اپنے جوتے کو آہستہ آہستہ فرش پر گھسنے لگا تاکہ اس کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آسکیں۔

کلثوم کہہ رہی تھی "میرا کوئی ساتھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں مگر سارے کے سارے تاجر ہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔ کوئی ایسا ذہن نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ میرے ساتھ مل کر میری سکیم چلا سکے۔ لیکن میں کیا! میں تو خود ان کے ساتھ اُسی دھارے میں بڑی تیزی سے بہے جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرا مستقبل کیا ہو گا۔ مجھے اس دن کا علم ہے جب میری تعلیم کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ میں تو اس دن کا انتظار کر رہی ہوں۔ شوق سے ہاں! بڑی شدّت سے۔"

اسی طرح کے بے شمار فقرات دُہراتی وہ وہاں سے چل دی۔ نہ میں نے ان باتوں کا کوئی جواب دیا نہ اُس نے پلٹ کر پوچھا۔

جب سے وُہ کراچی سے آئی تھی کچھ اُلجھی اُلجھی سی رہتی تھی۔ عجیب عجیب سوال پوچھتی تھی۔ کیسی کیسی سکیمیں بناتی تھی۔ اپنے تمام رشتہ داروں حتّٰی کہ امّی اور ابّا کے متعلق بھی پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہہ جاتی۔ ادھوری ادھوری باتیں۔ ٹوٹے پھوٹے جملے اور مدھم مدھم سرگوشیاں!

میں اس سے ملتے ہوئے اب اس لیے کترانا تھا کہ اس پر میری حقیقت کھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ماکس بے کے مچھیروں کی تعریفوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وُہ میری خفت ٹال رہی ہے۔ ورنہ اُسے کیا پڑی تھی کہ ہر روز انہی کی باتیں کیا کرتی۔

ایک رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح جا کر اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں سجاول ماہی گیر کا بیٹا ہوں اور میرا نام نذارا ہے۔ میں خود بھی ٹاپا پھینک پھینک کر مچھلیاں پکڑتا رہا ہوں اور مجھے پھنگا مچھلی سب سے زیادہ لذیذ لگتی ہے لیکن یہ فیصلہ میں نے اس وقت کیا تھا۔ جب میں مائی کے تنور سے ایک آنہ کی دال روٹی کھا کر اپنی پھٹی ہوئی بنیان اور نیکر پہنے مونج کی چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ مگر صبح جب مجھے اپنی ہستی کا اعتراف کرنا تھا تو میری کوڑیالی ٹائی نے اپنا پھن اٹھا کر کہا "ادلی ہوں"۔

ادبی کتابوں سے منہ موڑ کر کلثوم اقتصادیات اور معاشیات کی اوندھی سیدھی کتابیں پڑھنے لگی۔ سارا دن لائبریری کی ایک ہی الماری سے چمٹی رہتی اور کاغذ کے پرزوں پر لمبی لمبی عبارتیں لکھ کر انھیں اپنے تھیلے میں ڈالتی رہتی۔ وہ ادب کی شاہراہ پر چلتے چلتے افادی الاقتصادی بن گئی اور اس نے شیکسپیئر، ہارڈی اور کیٹس کو ایک دم بھلا دیا۔ یونیورسٹی لائبریری میں انگریزی ادب کی الماریوں کے پاس سے گذرتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ کہا "آپ کو پتہ ہے انفرادی جذبات کی ترجمانی کرنے والا سارا ادب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"فوت ہو جائے گا" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں" وہ ہنس پڑی۔ اُس کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ یہ نہایت ہی موزون لفظ ہے۔

افادی اپنے خیالات میں دن بدن کٹر ہوتی چلی گئی اور وہ ادب سے کافی دور ہو گئی۔ ایک آدھ مرتبہ اُس نے اشارتاً کہا بھی کہ وہ امتحان نہ دے سکے گی کیونکہ بہت سی اَن ہونی باتوں کا جواب دینے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کے اس رویّہ سے سخت شکایت تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کسی دن چپکے سے لائبریری جا کر اس الماری کی کتابوں کے درمیان فاسفورس کا ایک تنکا رکھ آؤں لیکن پھر خیال آتا کہ اُسے رنج ہو گا۔

یونیورسٹی لائبریری سے ایک دن اچانک مجھے ایک انگریز مصنّف کے خطوط کی کتاب مل گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک دو خط پڑھے۔ یہ کتاب لائبریری میں ۱۹۲۷ء سے پڑی تھی۔ مگر ایک مرتبہ بھی اشوع نہ ہوئی تھی۔ میں وہ کتاب لے کر آ گیا اور رات گئے تک پڑھتا رہا۔ بڑے جذباتی خطوط تھے۔ سیدھی سادی زبان میں پیاری پیاری باتیں لکھی تھیں۔ پہلا خط کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا:

جانِ تمنا!

جاننا چاہتی ہو کہ تمھارے چلے جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔ مجھ سے پوچھتی ہو کہ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کے ننھے ننھے جھونپڑے مجھے اب بھی ویسے ہی حسین نظر آتے ہیں اور وادی میں گلاب اور یاسمن کی نکہت اب بھی ویسی ہی طرب انگیز ہے۔ جب تم یہاں تھیں ہے۔۔۔۔ افسوس! ہر چیز نے اپنا لطف اور انداز بدل دیا ہے۔ جب سے تم نے اس وادی کو چھوڑا ہے میں صاحبِ فراش ہوں۔ آج جونہی میں کھانے کی میز پر بیٹھا میرا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا۔ تنہا رکابی، ایک چھری، ایک کانٹا اور پانی کا ایک گلاس۔ میں نے دُکھے دل سے اس کرسی کی طرف دیکھا جس پر تم بیٹھا کرتی تھیں۔ اُسے خالی دیکھ کر میرا جی بھر آیا اور میں نے چھری اور کانٹا میز پر ڈال دیے اور اسی رومال سے منہ ڈھانپ لیا ۔۔۔۔ مجھ سے پوچھتی ہو کہ مجھے وادی کی بہاریں اب کیسی لگتی ہیں....

دوسرے دن پروفیسر کے آنے سے ذرا پہلے میں نے وہ کتاب کھول کر افادی کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے ورق اُلٹ کر مصنف کا نام دیکھا اور پڑھنے لگی لیکن پروفیسر آگیا اور اُسے کتاب بند کر دینا پڑی۔ لیکچر کے دوران میں اُس نے کئی مرتبہ کنکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کتاب کی جلد پر اُنگلی سے کچھ لکھتی رہی پروفیسر کوئی باریک نکتہ بیان کرنے لگا۔ ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور افادی نے بھی گردن ذرا سی ٹیڑھی کر کے پروفیسر کو دیکھنا شروع کیا۔ بےخیالی میں اُس نے کتاب کی جلد کو کھولا اور اس کے کھڑے کنارے پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی۔ پھر اس کی ٹھوڑی ذرا پھسلی اور اس کے کنارے پر اس کے لب پہنچ گئے۔ ایک دو مرتبہ اس کے لب آہستہ آہستہ ہلے اور پھر اس کے سفید سفید دانت اس کنارے پر ٹک گئے اور دیر تک ٹکے رہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے یسوع اپنے مہمانوں کے پاؤں دھو کر انھیں بوسہ دے رہا ہے۔

جاتے ہوئے وہ کتاب اپنے ساتھ لے گئی اور دوسرے دن جب وہ کتاب میرے پاس پہنچی تو اس پر جا بجا نشان لگے تھے اور اس کی جلد کے ایک کونے پر ارغوانی رنگ کا ایک چھوٹا سا بوسہ چپکا ہوا تھا۔ افادی نے اس کتاب کے بارے میں

مجھ سے کچھ نہ کہا اور نہ میں نے پوچھا۔

اگلے دن میں نے لائبریرین کو بتایا کہ وہ کتاب گم ہو گئی ہے اور مجھ سے اس کی قیمت لے لی جائے۔ دیر تک پُرانے پُرانے رجسٹر دیکھنے کے بعد اُس نے کہا کہ یوں تو اس کتاب کی قیمت دو روپے ہے لیکن نایاب ہونے کی وجہ سے ہم چودہ روپے چارج کریں گے۔ یکمشت چودہ روپے میں نے زندگی میں چند مرتبہ ہی دیکھے تھے۔ میں نے گڑگڑا کر مزید رعایت کے لیے کہا لیکن وہ اسی قیمت پر اڑا رہا۔ ہاں ایک رعایت اُس نے یہ ضرور دی کہ میں وہی کتاب بازار سے لے کر لائبریری میں داخل کروا دوں۔ چودہ روپے ملنے محال تھے اور کتاب دستیاب ہونی ناممکن تھی۔ میں نے اپنے سیٹھ سے روپے مانگے تو اس نے ضمانت طلب کی۔ جس کے پاس میں ڈیڑھ سال سے کام کر رہا تھا وہی آج مجھ سے ضمانت طلب کر رہا تھا۔ تین چار دن کے بعد میں نے وُہ کتاب لائبریرین کو واپس کر دی کہ کتابوں کے انبار تلے آ گئی تھی۔

جس طرح رادھا بندرابن کے گلی کوچوں میں سے ہوتی ہوئی کنج گلی پہنچ کر شام کے دوارے آ کھڑی ہوئی تھی اسی طرح میں لائبریری کی بڑی بڑی الماریوں کے پاس سے گذرتا ہوا سیدھا اس الماری کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور وُہی کتاب نکال کر دیر تک ارغوانی رنگ کے اس مُنے سے پھول کو دیکھ کر واپس آ جاتا۔

امتحان قریب آ گئے تھے اور میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کلثوم کی یاد وابستہ ہو۔ دیوانِ غالب پر میں نے اپنا نام نہ لکھا تھا۔ سوچا اس پر اس کے آٹوگراف لے لوں گا اور شاعری اور افادیت کو ایک جگہ اکٹھا کر دوں گا۔ لیکن وُہ نہ مانی اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ”میں کوئی لیڈر نہیں، ادیب نہیں، مشہور ہستی نہیں۔ آٹوگراف کس لیے دوں۔“ اس پر میں اس سے ناراض ہو گیا اور اس سے بولنا بند کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ مجھے بلانے کی کوشش کی مگر میں بولا نہیں۔ ایک دن اس نے راستہ روک کر کہا ”امتحان کے بعد تو روٹھ جانا۔ ابھی تو دو مہینے پڑے ہیں۔ اس کے بعد ساری زندگی روٹھے ہوئے ہی گذرے گی۔“

میں نے مُنہ تھتھا کر جواب دیا ”میں امتحان سے پہلے ہی اپنے درمیان خلیج ڈال لینی چاہتا ہوں۔ مجھے . . .“

اس نے بات کاٹ کر کہا "خلیجیں بہت گہری ہوتی ہیں اور وہ پاٹی نہیں جا سکتیں اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے یہ وسیع ہوتی جاتی ہیں۔"

میں نے بڑی شان سے جواب دیا "ہوا کریں۔ انھیں پاٹنا ہی کون ہے۔"

امتحان قریب آتا جا رہا تھا اور وہ پڑھائی سے لاپرواہ ہوتی جا رہی تھی۔ کئی کئی دن تک کالج نہ آتی اور جب آتی تو ایک آدھ پیریڈ بعد چلی جاتی۔ سر ہندر نے ایک بار اس سے امتحان دینے کے ارادے کی بابت پوچھا تو اس نے مغلیہ شاہزادیوں کی طرح گردن اونچی کر کے کہا "ہم ضرور امتحان میں بیٹھیں گے" لیکن شاید اس کا ارادہ نہیں تھا۔

مسلسل ایک ہفتہ غائب رہنے کے بعد وہ اپنے نیلے رنگ کے تھیلے کو ہاتھ میں جھلاتی کالج گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ سرس کے درخت تلے شکستہ بنچ پر بیٹھے ہوئے میں نے ایک مرتبہ اسے دیکھا اور پھر کتاب پڑھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور زمین پر پڑے ہوئے ادھ جلے سگریٹ کو دیکھنے لگی۔ جو میں نے اسے ادھر آتے دیکھ کر پھینک دیا تھا۔ اپنا تھیلا کھول کر کلثوم نے اس میں جھانکا اور بولی "ہونہہ نہیں بولتے تو نہ سہی!" اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گولڈ فلیک کا ایک ڈبہ نکال کر بنچ پر رکھ دیا۔ پھر جدھر سے آئی تھی ادھر ہی چل دی۔ میں نے ایک نظر ڈبے کو دیکھا اور پھر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا تھیلا آگے پیچھے جھول جھول کر کہہ رہا تھا "پھیپھڑے کالے ہوتے ہیں۔ انگلیاں کالی ہوتی ہیں۔"

اس کے بعد نہ وہ کالج آئی نہ اس نے امتحان دیا اور نہ کہیں ملی۔

بی۔ اے آنرز کی فرسٹ کلاس ڈگری تو مل گئی مگر نوکری کہیں نہ ملی۔ وظیفے کے چھ روپے ختم ہو گئے اور لاہور میں گذران کرنی مصیبت بن گئی۔ ہر روز پانچ چھ عرضیاں ہاتھ سے لکھ کر یا ٹائپ کروا کر دستی یا بذریعہ ڈاک مختلف دفتروں میں پہنچا دیتا مگر یہ وہ دن تھے جب سال میں دو تین آسامیاں نکلتیں اور یونیورسٹی سے چار پانچ سو گریجویٹ۔ گولڈ فلیک کا وہ ڈبہ جو اتنا عرصہ سنبھال سنبھال کر رکھا تھا آخر ایک دن کھلا اور سگریٹیں ختم ہو گئیں۔ چاچا نے پھر خط لکھا کہ کمیٹی کی نوکری کر لوں۔

سیٹھ نے کہا۔ دس روپیہ مہینہ لے لو اور دن بھر کام کرو۔ لیکن میں کم از کم تحصیلدار ہونا چاہتا تھا یا ایسی نوکری کی تلاش میں تھا جہاں ایک علیحدہ کمرہ میں میرا دفتر ہو اور میرے گھنٹی بجاتے ہی جھپاک سے ایک چپڑاسی چق اُٹھا کر اندر داخل ہوا کرے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایک دو دفتروں میں جگہیں خالی بھی تھیں۔ لیکن وہاں گھنٹیاں سُن کر مجھے چق اُٹھا کر اندر جانا تھا۔ میں نے ویسی نوکری سے انکار کر دیا۔

جب تحصیلداری، نائب تحصیلداری، ضلعداری، آبکاری اور خودکشی کے تمام دروازے بند ہو گئے تو میں بغیر کسی کو اطلاع دیے سندھ چلا گیا اور تال پوروں کی نوکری کر لی۔ ان کی زمینوں کی آمدنی کا جمع خرچ کر کے ہر روز بڑے سائیں کو ایک پرچہ بھیجنا پڑتا۔ اس کے صلہ میں مجھے دس روپیہ ماہوار ملتے اور دو وقت کا کھانا۔ تالپور دنیا بھر کی سب سے شریف قوم ہے۔ وُہ شکار کھیلنے جاتے تو گاؤں کے کمینوں اور اپنے مزارعین کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ جب وُہ شکار مار کر لاتے جب بھی یہ لوگ ساتھ ہوتے اور جب شکار بھونا جاتا تو بھی اور جب وُہ کھانے لگتے اس وقت بھی ہم ان کے گرد کھڑے ہوتے۔

بڑے سائیں اکثر کہا کرتے "منشی جی! سارا دن یونہی بیٹھے لکھتے رہتے ہو۔ کھیتوں پر جا کر مزارعوں کے ساتھ ہل ہی چلایا کرو۔"

میں ان کی بات سُن کر مسکراتا اور یونہی بیٹھے لکھنا چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ چاچا کو لکھ دوں کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ماں کو میری موت سے زیادہ مجھے بنگلہ اور کار نہ ملنے کا دُکھ ہو گا۔ کسی اندھیری رات کو جب بڑے زور کی بارش ہوتی اور بجلی بار بار چمکتی تو مجھے خیال آتا کہ اس وقت دکھائی ڈاٹن ایسی رات میں چاچا بھنور جال پھیر پھیر کر مچھلیاں تلاش کر رہا ہو گا اور ماں کوٹھی میں بیٹھی ہم دونوں کو یاد کر رہی ہو گی۔ کونے میں کشتی چلانے کے ڈانڈ رکھے ہوں گے اور چولھے کے پاس لکڑ کا حقہ پڑا ہو گا جس کی چلم چولھے کی راکھ میں اوندھی پڑی ہو گی۔ ماں ہر روز میری لالٹین صاف کر کے جلاتی ہو گی اور اس کے پاس ٹاپا لے کر بیٹھ جاتی ہو گی جس میں وُہ سیسہ کی گولیوں کی بجائے اپنے آنسو پروتی ہو گی۔ ایسی بارشوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ دریائے سندھ کے کنارے کی یہ دیہاتی زندگی مجھے شدت سے اپنا وطن یاد دلانے لگی اور میں نے تال پور دل

کی نوکری چھوڑ دی۔

حیدرآباد کے اس اسپتال میں مجھے نرس بوائے ہوئے آج آٹھ سال ہوئے ہیں۔ نرسیں، قینچیاں، نشتر، سوئی، دھاگے، زخم، دوائیاں، مریض اور آہنی چارپائیاں میری زندگی کا جزو بن چکی تھیں پر پتہ نہیں اس وقت میرا جی کیوں اس نوکری سے بھی بیزار ہو گیا ہے۔ کل رات سیاہ رنگ کی ایک خوبصورت سی کار وارڈ کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ مریض کو سٹریچر پر ڈال کر پلنگ پر لٹایا گیا۔ سیٹھ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو بڑی بڑی رقموں کا لالچ دے کر مریض کو بچا لینے کی التجا کر رہا تھا۔ میں پرے کونے میں ہیٹر جلا کر سرنج اُبال رہا تھا۔ میرے ساتھی نے قریب سے گذرتے ہوئے کہا "ایک اور مصیبت"۔

اپنے ایپرن کی ڈوریاں کستے ہوئے میں ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا۔ نئے مریض کے قریب سے گذرتے ہوئے میں نے اس مصیبت پر نگاہ ڈالی۔ وہاں کلثوم پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ویسا ہی تھا ہونٹوں کی سرخی قائم تھی اور وہ بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے سیٹھ کا کندھا تھپتھپا کر کہا "گھبراؤ نہیں، سیٹھ، بچ جائیں گا، بچ جائیں گا! یہ کوئی جانستی خطرناک بیماری نئیں۔ دورہ پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گا..."

"تو میں جاؤں؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"جاؤ! جاؤ" ڈاکٹر نے آستین چڑھا کر کہا "کب واپس آئیں گا؟"

"کل دوپہر کو" سیٹھ نے سوچ کر کہا "کراچی کسٹم کا تار آیا ہے۔ ادھر ہمارے امپورٹ مال کا جھگڑا ہے۔ میں جاتے ہی کھلاس کرا لوں گا۔"

سیٹھ چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اندر آ کر ٹیکا دیا اور مجھے مریض کے ہوش میں آنے کی رپورٹ کے لیے کہہ گئے۔

بارہ! ایک! دو —— ڈھائی بجے میں اسٹول سے اُٹھا اور اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے کلثوم کا کندھا ہلا کر میں نے کہا "افادی!" مگر وہ بولی نہیں۔ دوسری مرتبہ میں نے ذرا زور سے پکارا "افادی"۔

ہونٹوں کو ذرا سی جنبش ہوئی اور آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔ میں نے خوش ہو کر اُسے پھر ہلایا اور وہ آنکھیں کھول کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اب اُن

آنکھوں میں صبح بنارس کی سی نرمی نہ تھی۔ وُہ کچھ دھندلاسی گئی تھیں۔ میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ایک مرتبہ پھر پکارا۔ آنکھوں کو پھر جُنبش ہوئی اور دریا کے کناروں پر چھائی ہوئی اس دُھند کے پیچھے مجھے وہی باغ والی لڑکی نظر آئی جو ہولے ہولے کہہ رہی تھی "دیکھا ہم نے تمھیں پھر معاف کر دیا!"

کلثوم سب کے لیے مر گئی تو میرے لیے بھی ختم ہو گئی۔ میں یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتا کہ وُہ زندہ ہے یا وُہ ازل سے میرے پاس تھی اور ابد تک رہے گی۔ وُہ واقعی مر چکی ہے اور مجھ سے اتنی بڑی حقیقت جھٹلائی نہیں جاتی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کلثوم مر گئی ہے لیکن اس کا علم کسی کو نہیں کہ نادی بھی ختم ہو گئی ہے۔ ہر شخص کو پتہ ہے کہ یونیورسٹی لائبریری کی کتابوں میں نیم کے سوکھے اور خستہ پتے ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ایک کتاب کے ساتھ ایک سوکھا ہوا ارغوانی پھول بھی چمٹا ہوا ہے۔

بابا

جب سُورج کی پہلی کرن ٹین والی چھت کے سُوراخ سے اندر داخل ہوئی اور اُس نے ایلین اور وحید کو سوتے ہوئے پایا تو وُہ چپ چاپ ویسے ہی باہر لوٹ گئی کیونکہ آسمان پر مٹیالے بادل تیرتے پھرتے تھے اور ان کا گرج گرج کر برس جانے کو جی چاہتا تھا۔ جب سُورج کی وہی کرن دوبارہ اندر آئی تو ایلین کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اپنا سر اُٹھا کر وحید کو دیکھا جو ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا اور جس کی آنکھیں خوابیدہ بچوں کی طرح ذرا ذرا کھُلی تھیں۔ گالوں پر خط کا سرمئی غبار سیاہی مائل ہو گیا تھا اور بالوں کی چمک دار نمود غیر ہموار تھی۔ ایلین نے اپنی مرمریں ناک کی گلابی پھننگ کو پیار سے وحید کے گالوں کے اس ریگ مالی پر پھیرا اور دو کنکنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ کر اس کو ہلانے لگی۔ درِ فتنہ باز ہوُا۔ وحید نے ایلین کے گریبان سے باہر لٹکی ہوئی طلائی صلیب کو دیکھا اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ سُورج کی کرن دبے پاؤں پھر باہر نکل گئی۔

بابا مسعود کو لے کر رہٹ پر گیا تھا۔ کچھُ دنوں سے وُہ اسے کلمہ سکھا رہا تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، بابا مسعود سے لا الٰہ الّا اللّٰہ سُنا کرتا اور جب وُہ ایک مرتبہ بالکل ٹھیک سُنا دیتا تو وُہ اسے میٹھی گولیاں اور بسکٹ دیتا۔ اب بھی وُور رہٹ کی گدی پر بابا مسعود کو گود میں لیے کمالو کو کلمہ سنوا رہا تھا۔ سامنے بیری کے نیچے لیگ ہارن اور ریڈ روڈ زمین کرُید کرُید کر دانے چگ رہی تھیں اور "ختلی" کھیریل تلے اپنے نومولود بچھڑے کو چاٹ رہی تھی۔ کمالو نے دلوا دیر سے بالٹی اُٹھا کر کہا "چاچا جب تک تم یہاں ہو میں ختلی دوہ لوں۔ ذرا دیر ہو گئی تو ڈکرانے لگے لگی۔ پھر تم وحید بھائی کے غصّہ سے تو واقف ہی ہو۔"

"دوہ لے" چاچا نے اطمینان سے کہا اور مسعود کی جیب میں پھونک مار کر بولا "دیکھوں، یہاں کیا بھر رکھا ہے۔"

مسعود نے تھوڑی سی مزاحمت کی تو بابا نے اپنی جیب سے گولی نکال کر کہا "اچھا نہ دکھا ——— ہم گولی نہیں دیں گے۔"

گولی دیکھ کر مسعود نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور لپ سٹک کا خول باہر نکال کر مٹھی کھول دی۔ بابا نے خول اس کے ہاتھ سے لے کر برسیم کے سبز مخملی کھیت میں پھینک دیا اور مسعود کی پیٹھ پر دھپیا مار کر بولا "بیٹا اسے جیب میں نہیں رکھا کرتے۔ یہ زہر ہے زہر۔ اسے پاس رکھو تو آدمی مر جاتا ہے۔"

"لیکن ممی تو اسے ———"

"تو ممی کی بات چھوڑ۔" بابا نے ناک سکوڑ کر کہا "وہ عورت ہے تو مرد مسعود احمد ——— چوہدری مسعود احمد۔ اور یہ زہر صرف مردوں ہی پر اثر کرتا ہے۔"

مسعود اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اُس نے ہونٹ لٹکا کر کہا "اچھا اگر میرا کارتوس پھینکا ہے تو مجھے میٹھی گولی تو دو بابا ——— پر میں تین گولیاں لوں گا۔ میرا کارتوس اتنے سو روپے کا تھا۔" اس نے ہاتھ پھیلا کر روپے بڑھائے اور بابا نے اپنی جیب میں سے ساری گولیاں نکال کر اسے دے دیں۔

"پروٹیکیس الیلیپ! پروٹیکیس الیلیپ!" ایلین نے وحید کے گالوں کو تھپتھپایا "دیکھو کیسا سہانا موسم ہے۔ ابابیلوں کی آوازیں سنتے ہو ابھی بارش ہو گی۔ ذرا سی دیر میں جل تھل ہو جائے گا۔ اُٹھو، جنگلی کے بچھڑے کو دودھ پلائیں۔ اگر وہ آج بھی بھوکا رہا تو شام تک مر جائے گا اور پھر دیکھنا تمھاری۔ . . . لو اب اٹھو بھی۔ خدا کے لیے اتنی دیر تک نہ سویا کرو چندا۔"

وحید نے گل بیاں ڈال کر پوچھا "پھر دیکھنا تمھاری۔ . . . کیا؟"

ایلین نے جواب دیا "کچھ نہیں۔"

وحید نے اسے زور سے بھینچ کر کہا "کچھ تو ہے ——— اچھا جب تک تم بتاؤ گی نہیں ہم چھوڑیں گے نہیں۔"

"تمھاری شامت آئے گی۔ بابا پوچھیں گے تمھیں کس استاد نے یہ سبق پڑھایا کہ بچھڑوں کو تھنوں سے دودھ نہیں پینے دیتے۔"

"ٹھیک ہے شامت تو آئے گی اور جب اس کا آنا لازمی ہے تو ہم تردد کیوں کریں۔ آؤ ایک بار پھر سو جائیں۔ جب دوبارہ اُٹھیں گے تو شامت آ کر

چلی بھی گئی ہو گی۔"

ایلن نے شال پرے کھینچ کر کہا "نہیں بھئی اُٹھو۔ اب میں تمھیں سونے نہ دوں گی۔"

ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا روشندانوں سے اندر گھس آیا اور باہر ٹپاٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔

"موسم تمھارے ساتھ ہے۔" ایلن نے مسکرا کر کہا اور اسے پھر شال اڑھا دی۔ خود اُٹھی، صلیب کو گریبان میں ڈال کر سنہرے بالوں میں برش پھیرا اور برآمدے والا دروازہ کھول کر چوکھٹ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے رہٹ سے کمالو "اجالا" کو کھول رہا تھا اور بابا مسعود کو کندھوں پر اُٹھائے بھاگا آ رہا تھا۔ بابا کی پگڑی مسعود کے سر پر تھی اور اس کا کھیس مسعود کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایلن نے ممتا بھری نظروں سے ادھر دیکھا اور پلٹ کر وحید سے پوچھا "تمھارے دیس میں سارے دادے اپنے پوتوں سے کیا ایسا ہی پیار کرتے ہیں ؟"

"ہوں۔" وحید نے تکیہ کے نیچے ہاتھ پھیر کر سگریٹ کیس ٹٹولا اور دیا سلائی جلا کر کہنے لگا "یہاں مول سے بیاج زیادہ پیارا ہوتا ہے۔"

جب وحید نے سر کے اشارے سے اپنے پاس بُلایا تو وہ چُپ چاپ اس کے قریب آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور باہر برستی ہوئی شفاف بوندوں کو اپنی لمبی آنکھوں میں بلاوے دیتی ہوئی سرگوشی کرنے لگی "ایسے ہی ایک دن تم انگلستان آئے تھے۔ سارے قصبہ پر کہر کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں اور شمال میں زور کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اس دن خواہ مخواہ میرا جی چاہ رہا تھا کہ مجھے ڈر لگے اور میں اپنے کمرے میں سفید موم بتی جلا کر بائیبل چوم کر کھولوں اور پھر اسے اپنے گھٹنوں پر ڈال کر یہ سوچنے لگوں کہ اگر اس خوف میں ذرا سا اضافہ اور ہو جائے تو یہ لمحے کتنے پیارے ہو جائیں ۔۔۔ اور پھر ایک دن ہم جہاز میں سوار ہوئے تھے جو بہت سی انگریزی مصنوعات اور ہندوستانی طالب علم لے کر بمبئی جا رہا تھا۔ اگر اس دن میں تمھارے ساتھ نہ آتی تو پتہ نہیں تم اکیلے کہاں مارے مارے پھرتے اور اب جبکہ میں یہاں پہنچ گئی ہوں۔ معلوم نہیں میرے ماں باپ کس حالت میں ہیں۔ انگلستان میں سینٹ نکولاس —— نکولاس "—— وہ وحید کی گود میں گر گئی اور بارش کی شفاف بوندیں جنھیں اُس نے

ابھی بلا وا دیا تھا اُس کی آنکھوں سے برسنے لگیں۔ وحید نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک منٹ کے لیے نگاہیں ادھر سے پھیر کر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور اس کا کندھا تھپتھپایا۔ لیکن جب ہلکی ہلکی سسکیوں سے ایلن کا جسم چھوٹے چھوٹے ہچکولے کھانے لگا تو وحید نے سگریٹ پرے پھینک کر اس کے چہرے سے سنہرے بالوں کو پیچھے ہٹا کر دیکھا۔ براق نگینے اس کے گوشۂ چشم سے پھسل کر ناک کی پھننگ پر ذرا سی دیر کے لیے ٹھیرتے۔ پھر اس کی کلائی کے گرد لپٹی ہوئی سونے کی زنجیر کے حلقوں میں جذب ہو جاتے۔ وحید نے ایک دم اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے کندھے پر ٹھوڑی رگڑ کر کہنے لگا۔ "اچھا! اچھا! ہم پھر ابنگڈن چلیں گے۔ پاپا سے ملیں گے۔ جوزف سے ملیں گے اور تمہارے سینیل کو ساتھ لے کر آئیں گے۔" لیکن ایلن کی سانس میں ہچکیوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سانس سیٹیاں بجاتی رہی۔ پھر وحید نے کچھ نہ کہا، نہ اپنی گرفت سخت کی۔ اُسے معلوم تھا کہ ذرا سی ہمدردی بھی اس مون سون کے راستہ میں اُونچا پہاڑ بن جائے گی۔

—— اور شام تک اندر باہر ایسے ہی بارش ہوتی رہی۔

اپنا اچھا بھلا سُلگتا ہوا حقہ چھوڑ کر بابا چارپائی سے دبے پاؤں اُٹھا اور سجادل جولاہے کے گھر جا کر محفل میں شریک ہو گیا۔ یہی باتیں تھیں جن سے وحید چڑتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وُہ دبے پاؤں یاروں کی محفل میں پہنچا تھا۔ کمّو نے کہا "چاچا، وحید بھائی کو پتہ لگ گیا تو بہت برہم ہوگا اور جب تیرے ساتھ ایسی ویسی قانونی بات کرنے لگتا ہے تو قسم قرآن شریف کی مجھے تاؤ آ جاتا ہے۔"

چاچا نے کہا "ارے جا بیٹھ! تو کیا جانے بیٹے کیا ہوتے ہیں۔ ذرا اپنا مقدر تو بنوا لا ایسی باتیں سُننے کے لیے۔"

سائیں نے کہا "چاچا یہ تو بلینڈا ہے بلینڈا۔ اور پھر اس کا دماغ تم جانو یہاں ہوتا ہے یہاں۔" اُس نے ٹخنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

چاچا نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے سجادل کو ٹھوکا دیا۔ "میں پوچھوں شیخ نمازی یہ آج چُپ کیوں سادھ رکھی ہے۔ کیا آج بیٹے کا سوٹ دینے آئی تُشتنک مار گئی؟"

سجادل ہنسا اور حقہ کی منہال کے گرد ہاتھ رکھ کر ایک لمبا کش لگایا۔ آنکھیں بند

کر کے دھواں چھوڑتے ہوئے ایک بار وہ پھر ہنسا اور چاچا سے کہنے لگا "حضرت وارث شاہ واقعی ولی تھا اور اگر نہیں تھا تو معلوم ہوتا ہے اُسے بھی کسی ایسی ہی سے پالا پڑا ہوگا۔"

سائیں نے کہا "شیخ جی یہ جُوڑے والیاں سب کو ولی بنا دیتی ہیں۔ ہم بھی ان کا جھوٹا کھا چکے ہیں اور سچ پوچھو تو یہ جوگ انہی کی دین ہے۔"

چاچا نے کہا "ہاں بھئی ٹھیک ہوگا۔ پر میں نے تو ایسے سارے ولیوں کو گل جنڈے پہنے ہوئے ہی دیکھا۔ اچھے اچھے جمالی خربوزے جھونجھ ہو کے رہ گئے۔ بھئی شاید انھیں اللہ نظر بھی آیا ہو، پر ہم نے تو دیکھا نہیں۔"

اس پر کمالو بہت ہنسا۔ اسے نہر کنارے والا قصّہ یاد آ گیا جب صوبان کے بھائیوں نے سائیں کو مرغا بنا کر بٹھایا تھا اور اس کی پیٹھ پر گھونسڑے مار مار کر پوچھتے تھے "کیوں سائیں ڈھولا کوئی طبق روشن ہُوا؟"

چاچا نے جُھوٹ موٹ غصّے ہو کر کہا "ابے اپنے آپ ہنسے جا رہا ہے۔ جا! جا کے کدال سے فصد کھلوا، پھر آ بیٹھک میں۔ تجھے تو حقہ پینا بھی نہیں آتا۔ ۔ ۔ ۔"

سجاول نے روہانسے ہو کر کہا "جب یہ کش کھینچتا ہے تو قسم ہے پیدا کرنے والے کی کہ میرا کلیجہ سُلگنے لگتا ہے ــــ اگلے لوگوں نے بھی کیا نکتے نکالے تھے کہ چار یاری میں حقّہ پینے والا کرموں سے ملتا ہے۔ ابھی دو منٹ کی بات ہے حقّہ ٹکے گن رہا تھا اور اب کیا گپت ہو گیا ہے۔"

کمالو کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ چاچا نے آہستہ سے کہا "یار بچھیری مجھے بھی پسند ہے مگر سالی کے بھونری ہے۔ ڈر لگتا ہے کہیں وحیدا سے خرید ہی نہ لے، کل سے اُس کے دل چڑھی ہوئی ہے۔"

سجاول نے کہا "نا چاچا۔ گولی مار ایسی بچھیری کے۔ تیرے گھر چاند سا پوتا ہے۔ بھونری والی گھوڑی لا کے۔ ۔ ۔ ۔ نا! نا! ایسا کام نہ کرنا۔"

کمالو بولا "چاچا بات تو شیخ نمازی کی سولہ آنے کھری ہے ــــ بڑے میاں جی بھی کہا کرتے تھے کہ بھونری والا گھوڑا ہرے کھیت سے گذر جائے تو کال پڑ جاتا ہے اور یہ تو۔ ۔ ۔ ۔"

چاچا نے جواب دیا "مصیبت تو یہی ہے۔ وحید میری بات نہیں مانے گا۔ اُدھ

اُس کی وہ میم، وہ تو ایسی باتوں میں اعتقاد ہی نہیں رکھتی اور یقین کرنا، اس وقت اَن تولی دھرتی پر بیٹھا ہوں۔ اُسے مسعود سے بھی محبّت نہیں۔"

"بالکل، بالکل!" سائیں ہنکارا "چاچا، جیسے ان انگریزوں کے رنگ صاف ہوتے ہیں ویسے ہی ان کے دل۔"

چاچا نے سنی اَن سنی کر کے کہا "کل صبح میں مسعود کو کپڑ چھان کر کے کانجی کا گلاس پلا رہا تھا کہ اوپر سے پہنچ گئی اور تنک کر بولی "بابا۔ کیا کرتے ہو۔ ماسود بس دودھ پیے گا۔ اسے اور کچھ مت دیا کرو۔"

"لو شیخ جی، یہ کانجی بھی آج دستورہ ہو گئی۔" اور پیشتر اس کے کہ شیخ جی جواب دیتے، چاچا نے پھر کہنا شروع کیا "پتہ نہیں اتنے سال ولایت رہ کر بھی وحید ویسے کا ویسا کیوں رہا۔ میں نے تو ڈاکٹری پڑھنے بھیجا تھا مگر وُہ دنیا جہان کا زمیندارا پاس کر کے آ گیا اور میم بھی ایسی چھانٹ کر نکالی جسے سوائے زمانے سے اُلٹ چلنے کے دوسرا کام ہی نہیں۔ کل میں نے وحید سے کہا کہ گھوڑی کو بچّہ دیے نو دن ہو چکے ہیں۔ اسے پھر بھر الو۔ ایک بچّہ اور دے دے گی تو پیسے پورے ہو جائیں گے۔ وُہ بھی پاس تھی۔ پہلے انگریزی میں اس سے کچھ گٹ پٹ کی۔ پھر مجھ سے کہنے لگی "نا بابا ایسا مت کرنا۔ ابھی اسے ایک سال آرام دیں گے۔ پھر اگلا بچّہ لیں گے۔ میں نے کہا "مستری حیات کو کہلوا بھیجو کہ اس کے لیے ایک پلنگ بھی بنا دے" ——— اور اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتا تھا، سائیں؟"

"ٹھیک! ٹھیک!" سائیں نے حقّہ پیتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا اور دیر تک اسی طرح ہلاتا رہا۔

اس دن جب وحید ڈسک کلیٹویٹر پر بیٹھا گھوڑوں کو کھیت میں چلا رہا تھا۔ تو ایلن نے ساتھ چلتے ہوئے یہ شکایت کی کہ وُہ ہر بار چچی ہی کے چابک لگاتا ہے حالانکہ اس کی رفتار اجالا سے کہیں تیز ہے۔ ایلن نے کہا "مرد لوگ بڑے متعصّب ہوتے ہیں کہ عورتوں کے علاوہ گھوڑیوں پر بھی ظلم کر کے خوش ہوتے ہیں حالانکہ عورتیں انھیں اندھیری راتوں میں بپھرے ہوئے دریاؤں کی لہروں میں کچّے گھڑوں پر تیر کر ملنے آتی رہی ہیں۔"

وحید نے غیر ارادی طور پر گھوڑوں کی راسیں کھینچ لیں اور متحیر ہو کر بولا "تمھیں یہ کس نے بنایا، ایلین ؟"

"چلو! چلو!" ایلین نے ہاتھ سے اشارہ کیا "گھوڑوں کو بڑھاؤ۔ میں تمھیں ساری کہانی سناؤں گی۔ پھر تم ہی فیصلہ کرنا مہینوال بہادر تھا یا سوہنی۔ گو کہانی سنانے والی شروع سے آخر تک مہینوال ہی کی تعریف کرتی رہی مگر میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

ایلین نے اپنی کمر پر لٹکتے ہوئے تنکوں کے بڑے ٹوپ کو طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کے مخالف اپنے سر پر جما لیا اور کہانی سنانے لگی۔ وحید نے رفتار ہلکی کر دی۔ گھوڑے قدم قدم چلنے لگے اور مشین کی تیز دھار تھالیاں زمین کے سینہ میں آہستہ آہستہ شانہ کرنے لگیں۔ راستہ چلتے چلتے جب کبھی ایلین کا پاؤں کسی اونچی نیچی جگہ پر آجاتا تو وہ کمان کی طرح ایک طرف جھک جاتی اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہیٹ کا نیلگوں ربن جھکورے لے لے کر ادھر ادھر سے اس کی گردن چومنے لگتا اور اس کے خاکستری فل بوٹ جن میں اس نے اپنی براؤن پتلون ٹھونس رکھی تھی چرمر چرمر کرنے اور پنجابی داستانِ عشق میں سسکیاں بھرتے معلوم ہونے۔ چڑھی ہوئی آستینوں سے میدہ اور شہابی بازو دھول کی ہلکی سی تہ سے تر بتر ہو رہے تھے۔

جب ایلین کہانی سنا چکی تو وحید نے ہل روک کر اپنا دایاں گال کھڑے زانو پر آرام سے ٹکا دیا اور ایک آنکھ میچ کر پوچھنے لگا "یہ تو سب کچھ ہوا۔ لیکن تم نے مرزا کی روداد الفت بھی سنی ہے؟ شمعِ محبت کے یہ دو پروانے تھے جن کی الفت پر حسیم غالب آگیا اور ان سے ایسی بھول ہو گئی جسے آج تک سب نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ افلاک سے اب عشق کا نزول بند ہو گیا ہے۔

ایلین نے کہا "ڈارلنگ، مجھے یہ کہانی ضرور سناؤ ــــ ابھی اس قصے کو شروع کر دو۔ میں تمھارے ساتھ ساتھ چلتی ہوں۔"

وحید نے راسیں سنبھالیں اور گھوڑوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن ابھی انھوں نے پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ نہر کے کنارے نیم کے بڑے پیڑ تلے مسعود نے منہ کے آگے مٹھی رکھ کر اونچی لے میں پکارا ــــ "ڈا ــــ ٹو ا ــــ سا می!"

انھوں نے ایک دم مڑ کر پیچھے دیکھا۔ نیم کے پاس ایک بڑی سی خوبصورت کار کھڑی تھی اور اس کے پاس دو تین آدمی کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ وحید

کلیٹو بڑ سے کود کر اُترا۔ ایلین نے اپنا ہیٹ پھر پیچھے گرا دیا اور دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے نہر کے کنارے پہنچ گئے۔

مسعود نے ہاتھ آگے پھیلا کر کہا "ڈیڈی، ان کا موٹر خراب ہو گیا ہے۔ تم ٹھیک کر دو۔" اس پر مسکراتا ہوا ایک انگریز آگے بڑھا اور اُس نے کہا "میرا نام ہبرٹ ہے۔ میں اس علاقے کا ایکس۔ای۔این ہوں۔ اس وقت دورے پر جا رہا تھا کہ موٹر میں کچھ خرابی ہو گئی۔ ڈرائیور ٹھیک کر رہا ہے —— اور ننھے میاں نے بغیر ہمیں پوچھے آپ کو بلانا شروع کر دیا۔"

وحید نے اپنی بیوی کا تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ ایلین ہے۔ اس کے والد انگلڈن کے کاٹیج ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں اور اس کا بھائی جوزف لندن میڈیکل کالج میں میرا ہم جماعت تھا۔ ہم دونوں کو زراعت پسند ہے اور ہم نے اپنی آبائی زمین کو جدید طریقے پر کاشت کرنا شروع کیا ہے۔"

ہبرٹ نے کہا "انگلڈن میں ایک مرتبہ میں بھی گیا تھا۔ وہاں میرا دوست کلارک رہتا ہے۔"

ایلین نے بات کاٹ کر کہا "ہاں، ہاں! میں اُسے جانتی ہوں۔ اس کے پاس بہت سے اچھے اچھے گھوڑے ہیں اور اس کے مشکی "ریمنڈ باڈ" کو اول نمبر کا انعام بھی مل چکا ہے۔ انگلستان میں اس سے بہتر نسل کا کلیو لینڈ بے سٹالین اور کہیں نہیں۔"

ہبرٹ نے سر ہلا کر جواب دیا "بالکل ٹھیک۔ وہی گھوڑوں والا کلارک میرا دوست ہے۔ میں گھوڑوں کے میلے پر پورا ایک ہفتہ اُن کے یہاں مہمان رہا۔"

وحید نے کہا "جب تک موٹر بنتا ہے آپ ہمارے مہمان رہیے۔ میں آپ کو ایلین کا باغیچہ اور مرغی خانہ دکھاتا ہوں۔"

ہبرٹ ان کے ساتھ ہو لیا۔

اُونچی پیڑی سے اُترتے ہوئے مسعود نے کہا "تیتریاں اور بطخیں میری ہیں اور مرغیاں ممی کی۔"

لیکن ہبرٹ نے یہ فقرہ سُنا نہیں۔ وہ ایلین کے ساتھ ان آدمیوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا جنھیں وہ دونوں اچھی طرح سے جانتے تھے۔

مُرغی خانے کے باہر بابا دیوار میں کیل ٹھونک کر رسّی باندھ رہا تھا۔ وحید نے برٹر سے کہا "یہ میرے والد ہیں اور میں نے اس فارم کا نام انہی کے نام پر رکھا ہے"۔ برٹر نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بابا کو سلام کیا اور مُرغی خانہ کے اندر داخل ہو گیا۔ ایلن نے ایک بنڈیٹ کھولتے ہوئے کہا "بابا ذرا کھیت جائیے۔ ہم اُجالا اور پچی کو اسی طرح چھوڑ آئے ہیں۔ انھیں ہل سے کھول کر شیشم تلے باندھ آئیے۔ کہیں ڈر کر خود کو زخمی نہ کر بیٹھیں"۔

بابا بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

وحید نے کہا "یہ ریڈ روڈ کا ڈربہ ہے۔ ابھی پچھلے ہفتہ کُڑک ہوئی ہے۔ ہر صبح اتنا بڑا انڈا دیا کرتی تھی"۔ اس نے انگلیاں پھیلا کر کہا "لیکن کسی ناشتہ پر بھی ہمیں یہ انڈا نہیں ملا۔ اب ان سے بچے نکلیں گے تو شاید"—— پھر وُہ ایلن کی طرف دیکھ کر ہنسا جس نے جواب کے طور پر مسکرا کر سر ہلانا ہی کافی سمجھا۔ لیگ ہارن اور منارکہ مرغیوں کے ڈربے علیحدہ علیحدہ تھے۔ ان پر ہر مرغی کا نام کوئلے سے لکھا تھا۔ انڈا دینے کی جگہ مشترکہ تھی۔ جہاں گھاس پھونس کے بہت سے گھونسلے بنے تھے۔ جس مُرغی کو انڈا دینے کی حاجت محسوس ہوتی ایک گھونسلے میں جا کر چُپ چاپ بیٹھ جاتی۔

مُرغی خانے کی کھڑکی میں سے چنبلی کو دیکھ کر برٹر نے پوچھا "یہ گائے آپ نے کہاں سے لی؟ —— اس کا بچہ نر ہے یا مادہ؟"

ایلن نے جواب دیا "نر —— نر نہ بھی ہوتا تو بھی ہم اسے کسی کو نہ دیتے۔ مجھے احساس ہے کہ ہم اس معاملے میں بہت ہی متعصب ہیں"۔

اس پر سب ہنسنے لگے اور مسعود حیرت سے ان کا مُنہ تکنے لگا کہ ایسی ہنسی کی بات ہی کب ہوئی تھی!

جب وُہ باہر نکلے تو آسمان پر اُودے اور کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کیکر کے درختوں تلے بکریاں چر رہی تھیں اور ان کے قریب ہی سبز سبز مخملی گھاس پر چنبلی گردن جھکائے اپنے بچے کو چاٹ رہی تھی جو اپنے کان جھٹک کر بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا مگر اُٹھ نہ سکتا تھا۔ بچہ کی پیدائش سے گائے کی ہڈیاں موتر سے نکل آئے تھے اور اس کا دُودھ سے بھرا ہوا پچھلی ٹانگوں میں مشکیزے کی طرح پھولا

ہوُا تھا۔ چنبلی کی اگلی ٹانگیں گھٹنوں تک سفید تھیں اور اس کے کلے کے نیچے سرمئی رنگ کی جھالر دبیز ریشمی پرچم کی طرح بل کھا رہی تھی۔ ان لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وُہ زور سے ڈکرائی اور پھر نوکِ زبان سے اپنے نتھنوں کو صاف کرنے لگی۔

گھاٹی پر چڑھتے ہوئے برٹ نے پوچھا کہ انھوں نے اصطبل اس قدر اونچا بنانے کی کیوں سوچی۔ نو وحید نے کہا "گھوڑے چڑھائی چڑھتے اور اترائی اُترتے بڑے خوب صورت لگتے ہیں۔ جب ان کے بڑے بڑے ساغری سُم زمین پر پڑتے ہیں تو گاچیاں نہایت لچکیلے انداز میں جھٹکے کھاتی ہیں اور ان کی گردنیں غیر معمولی طور پر اوپر نیچے ہلنے سے اپنی چمک دار اور سڈول پھلیوں کی نمائش اچھی طرح سے کر سکتی ہیں اور صبح صبح جب ایلن اصطبل کا دروازہ کھولتی ہے تو میں اپنے دریچے سے اُجالا اور پچی کو نیچے اُترتے دیکھتا ہوں۔ قدم تول تول کر رکھنے کی وجہ سے ان کی ایالیں ایسے ہلتی ہیں جیسے کوٹھے پر کنگھی کرتی ہوئی کوئی لڑکی نیچے صحن میں کسی کی آواز سُن کر ہچکچاتی ہوئی جلدی جلدی سیڑھیاں اُترے۔

برٹ نے ہنستے ہوئے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے آپ لوگ کاشت کم کرتے ہیں اور شاعری زیادہ۔"

ایلن نے بھویں اُوپر اُٹھا کر کہا "بالکل! بالکل! یہ بہت سُست ہیں۔ دُنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ میرا دل کتنا چاہتا تھا کہ یہ اپنے فن کو عروج پر پہنچاتے اور لوگ ان سے فائدہ اُٹھاتے ——— مسٹر برٹ، میرے خاوند الیف۔ آر۔ سی۔ ایس ہیں اور بجائے آپریشن کرنے کے زمین کھود کر آلو نکالنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ بابا جب انھیں ہل پر بیٹھے گھوڑوں کو ٹخ ٹخ کرتے دیکھتا ہے تو خون کے آنسو پی کر رہ جاتا ہے۔ اس کا اس دنیا میں سوائے اس بیٹے کے اور کوئی نہیں۔ اپنی آبائی زمین کا بیشتر حصّہ بیچ کر اُس نے انھیں ولایت بھیجا۔ ان کی خوشنودی کے لیے مُجھ سے شادی کرنے کی اجازت دی اور جب یہ تعلیم سے فارغ ہو کر لوٹے تو نوکری سے انکار کر کے بابا کے ارمانوں کا خون کر دیا اور آتے ہی اس جدّی پیشے کو سینے سے لگا لیا۔ فرق صرف اتنا ہے، بابا بیلوں سے ہل جوتتا تھا تو یہ گھوڑوں سے کاشت کرتے ہیں۔ پتہ نہیں انھیں . . . . . . پہلے تو یہ میری ہر بات مانتے تھے پر! . . . . ! . . . ."

"اب بھی مانتے ہیں ایلن اب بھی۔ ۔ ۔ ۔" وحید نے میٹھی نگاہوں سے اسے دیکھا اور معذوری کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے بولا "پر اب نوکری نہیں ملتی اور پھر وُہ فوجی نوکری جو تمھیں پسند ہے اب کہاں! اب تو جنگ ختم ہونے والی ہے اور بھرتی بھی بند ہے۔ جب ایسی نوکری ملے گی ضرور کریں گے —— یہ ہمارا وعدہ رہا۔"

برٹ نے کہا "بیویوں کے دل میں جو پیاری پیاری تمنائیں کروٹیں لیتی رہتی ہیں انھیں پورا کرنا ہی چاہیے۔ بابا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ خود مجھے اپنے باپ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن آپ کی مسز کے بارے میں میں یہ ضرور کہوں گا کہ انھیں سنہری سپنے بُننے کے لیے دھاگے اور مفلس لاہی دینے چاہیے —— اور اگر آپ کو نوکری مل جائے مسٹر وحید —— تو آپ کریں گے؟"

وحید نے وثوق سے کہا "کیوں نہیں؟ لیکن وہ ایلن کی مرضی کے مطابق ہو۔"

گارے اور بے ڈول پتھروں کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کی طرف اشارہ کرکے برٹ نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

ایلن نے جواب دیا "یہ ہماری سمتھی ہے۔ جب ہل کا کوئی پرزہ خراب ہو جاتا ہے یا چھکڑے کے دھرے اُتر جاتے ہیں تو ہم یہاں ان کی مرمت کیا کرتے ہیں۔ —— آئیے میں آپ کو ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی نعل دکھاؤں۔ ہم نعل بندی بھی خود ہی کیا کرتے ہیں۔"

نیچے اُترتے ہوئے وحید نے کہا "دیسی گھوڑے بڑی مصیبت ہوتے ہیں۔ آپ نے ہماری یہ مریل نکمی کنوتیوں والی گھوڑی دیکھی ہے نا۔ ہم آج تک بغیر پورنال کے اسے نعل نہیں لگا سکے اور وُہ اتنے گرانڈیل تھارو برڈ گھوڑے اس طرح سُم اُٹھائے رکھتے ہیں جیسے مہندی لگائی جا رہی ہو۔"

ایلن نے کہا "بابا کی کہنی پر ایک ہٹیلا مسا ہے۔ وُہ ہر ہفتے اُسے گھوڑے کی دُم کے بال سے کاٹتے ہیں لیکن وُہ پھر نمودار ہو جاتا ہے اور پتہ ہے ان کی ڈاکٹری کون کرتا ہے؟ ماسو! جس صبح بابا اپنی کہنی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں یہ پاس آکر پوچھتا ہے "بابا، بال لاؤں؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اُجالا اور پچی کی دُم سے بال یُوں نوچتا ہے جیسے دیوار پر چڑھی بیل کھسوٹ رہا ہو۔"

موٹر ٹھیک ہو گیا اور ہیرا اُن سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گیا۔ درخت سے بندھے ہوئے موم جامہ میں مسعود کو لٹا کر وہ پھر کھیت میں آ گئے۔ ایلین نے کہا "ایک تو میں تھک گئی ہوں۔ دوسرے شاید تمہارے نوکر ہو جانے کے بعد سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑے۔ اس لیے کیوں نہ میں ہی کلٹیویٹر چلاؤں۔"

جب ہل چلا اور تیز کناروں والے تَوے گھومنے لگے تو وحید نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "ہاں تو میں کہہ رہا تھا، مرزا اور صاحباں ویسے نکلے۔ ورنہ اس دنیا میں ابھی اور بہت سے لیلیٰ مجنوں اور رومیو جولیٹ پیدا ہوتے۔"

مسعود دن بھر سویا رہا تھا۔ اس لیے اب بابا کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹا مزے لے لے کر سوال کر رہا تھا "بابا! تارے رات کو کیوں نکلتے ہیں۔ دن کو کیوں نہیں نکلتے؟"

"دن کو نہیں نکلتے، بیٹا" بابا نے سمجھا کر کہا۔

مسعود نے کہا "اچھا! —— بابا، ہماری بیری کے پتّے ہرے کیوں ہیں؟"

"پتّے ہرے ہی ہوتے ہیں، بیٹا" بابا نے نباتات کا قاعدہ کلیّہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

مسعود نے پھر پوچھا "بابا، گھوڑے ہرے کیوں نہیں ہوتے؟"

کمالو جو چارپائی کی ادوائن کس رہا تھا زور سے ہنس پڑا "جو ہُوا ہی گھوڑا وُہ ہرا کیسے ہو گا؟"

مسعود نے مُڑ کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا تو بابا نے دھتکار کر کہا۔ "لعنتی، جو بولے گا تو کفن ہی پھاڑے گا۔ جا جا —— جا کے اپنی بیوی کو۔۔۔"

ایلین کو شام سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اسے شام کا وقت ایسے لگتا جیسے سفید بُرقعہ گھر میں دھو کر الگنی پر ڈالا ہُوا ہو۔ میلا میلا مرا ہُوا اُجلا۔ لیکن یہ شام تو اس سے بھی سوا تھی۔ نہر کی پٹڑی پر موٹر چلاتے ہوئے اُس نے وحید کو دیکھا جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا شیشے میں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اس کی گود میں پڑے تھے اور آنکھیں ایک ہی جگہ ٹکٹکی باندھے کچھ بھی نہ دیکھ رہی تھیں۔ بھوؤں کے ذرا

خم دار ہو جانے سے ناک کے دائیں بائیں جلد کھنچ سی گئی تھی اور ماتھے پر ایک سلوٹ اُبھرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایلن نے اس کے کان کے پیچھے تازہ حجامت میں دیرینہ زخم کا ایک چھوٹا سا نشان دیکھا جہاں بال نہیں اُگے تھے اور جس کے درمیان بہت سی باریک باریک جھریاں پڑی تھیں۔ ایلن نے پہلے یہ زخم نہ دیکھا تھا اس لیے یہ اُسے بہت ہی عجیب سا لگا —— جب وحید اپنے خیال سے چونکا تو ایلن نے اپنی نگاہیں دُور تک لیٹے ہوئے سنسان راستے پر جما دیں اور اس کی طرف سے ایسے مُنہ پھیر لیا جیسے ادھر دیکھا ہی نہیں۔

اسٹیشن کے باہر اسٹیشن ماسٹر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر وحید سے مصافحہ کیا اور اپنی ٹوپی اتار کر ایلن کو سلام کیا۔

وحید نے مسکرا کر کہا "معاف کیجیے گا ہم ذرا جلدی آ گئے —— ایلن کا تقاضا تھا کہ ہم وقت سے پہلے پہنچیں تاکہ آپ کو سگنل نہ دینے کی دوبارہ تاکید کی جا سکے"۔

اور اسٹیشن ماسٹر نے دونوں ہاتھ ہلا کر کہا "اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ آپ کا پیغام ہی میرے لیے کافی ہے۔ لیکن آپ پہلے چلے آئے تو مجھے بے حد خوشی ہوئی"۔

وحید نے ماتھے کے قریب سیدھا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "شکریہ! شکریہ! —— ایلن کا تو خیال تھا کہ یہ مجھے اگلے جنکشن پر چھوڑ آئے۔ لیکن میں نہ مانا۔ اس کی صحت دیکھیے۔ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے اور پھر ساٹھ میل کی ڈرائیونگ! مجھے یقین ہے بالکل نڈھال ہو جاتی"۔

اسٹیشن ماسٹر نے کہا "بیشک! بیشک! لیکن جب تک میں یہاں ہوں آپ کو جنکشن پر جا کر گاڑی پکڑنے کا خیال بھی نہ لانا چاہیے۔ کیا ہوا اگر دو تین منٹ میل یہاں ڈی ٹین ہو گئی۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ میں نے پوائنٹ مین سے کہہ دیا ہے کہ وہ آؤٹر سگنل نہ دے اور ٹوکن بھی دوشاخے پر اس انداز سے ٹکائے کہ لیا نہ جا سکے"۔

وحید نے سر ہلا کر کہا "بہت خوب! یہاں مجھے وہ قصہ یاد آ گیا جب اکبر ...."

کنٹرول کی گھنٹی بجی اور اسٹیشن ماسٹر معذرت چاہتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک کمرے سے باہر کسی بہرے کے ساتھ گفتگو کی آواز آتی رہی اور پھر باتوں پر ہاتھ

پھر نا اسٹیشن ماسٹر نمودار ہوا۔ اس نے لب کھولے بغیر ناک سے "ہونہہ" کر کے بتایا کہ میل پہلے ہی ایک گھنٹہ لیٹ آ رہی ہے۔

جب ایلن اور وحید کو چھوٹے سے ڈرائنگ رُوم میں بٹھا کر اسٹیشن ماسٹر باہر نکلنے لگا تو اُس نے دہلیز پر پیچھے گھوم کر وحید سے پوچھا "معاف کیجیے گا میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ آپ اس طرح اچانک دلّی کیوں جا رہے ہیں؟"

"ماسٹر صاحب" وحید اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے پتلون سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور دروازے پر پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایلن سے کہا "ایک منٹ ایلن" اور باہر نکل کر بولا "حکومت نے جبراً میری خدمات حاصل کی ہیں۔ العرفہ کے فوجی ہسپتال میں ابھی بہت سے ایسے مریض ہیں جن کا آپریشن نہیں ہو سکا۔ میجر گزور حرکتِ قلب بند ہو جانے سے مر گئے اور جن مریضوں کا آپریشن ہو چکا ہے ان کے معائنہ کے لیے کوئی موجود نہیں۔ فی الحال نرسیں اور دوسرے ڈاکٹر ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مجھے سیدھا میجر کا رینک دے کر بھیجا جا رہا ہے۔ میں وہاں جانے سے اگر خوش نہیں تو ناخوش بھی نہیں ہوں۔ ایلن کی خوشی اسی میں ہے کہ میں بل چھوڑ کر ایک بار پھر نشتر سنبھال لوں۔"

اسٹیشن ماسٹر نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کہا "یہ تو بہت اچھا ہے ڈاکٹر صاحب۔ خلقِ خدا کا فائدہ ہے اور آپ کی شہرت۔"

وحید نے ایک لمبا کش چھوڑ کر کہا "ہاں شاید کچھ ایسا ہی ہے۔"

پھر وہ اندر آ کر ساگوان کے بیڈول میز کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ ایلن اس کے پاس لمبے بنچ پر ٹانگیں رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی ایک کہنی میز کے کونے پر تھی اور دوسرا ہاتھ کمر کے پیچھے بنچ پر رکھا تھا جس پر اس نے اپنے سارے جسم کا بوجھ ڈال رکھا تھا۔ گریبان کا اوپر والا بٹن کھلا تھا اور گلے کی نیلی نیلی رگیں مرمریں جلد میں جوڑیو کے تاروں کی طرح خاموش پڑی تھیں۔ کنپٹیوں سے اُٹھتے ہوئے سنہرے بالوں کے لچھے آہستہ آہستہ سانس لے رہے تھے اور پُرسکون پتلیوں کے پیچھے جھلملاتے آنسو کہہ رہے تھے کہ ایسی شاموں کو ہم چراغاں کیا کرتے ہیں۔ وحید نے میز سے اس کا بازو اُٹھا کر اس کی کلائی ہاتھ میں پکڑ لی اور انگلیوں کی پوروں کو لبوں سے لگایا۔ چھنگلیا پیچھے مڑ گئی اور سیدھی انگلی آگے جُھک گئی۔ درمیانی انگلی ہونٹ کے ایک

کونے سے جاگی اور ساتھ والی نے اُوپر کے ہونٹ کو ذرا اُونچا اٹھانا چاہا۔ ناخنوں سے کیلے کی خوشبو آ رہی تھی اور سانس میں چاٹے کی لپیٹ تھی۔

"ایلن!" وحید نے ہولے سے کہا اور اس نے اپنی ٹھوڑی اوپر اُٹھا دی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دیپ جلا اور جھلملا گیا۔ پھلی کمنی کے جوڑ سے ایک آواز نے پیدا ہونا چاہا لیکن رُک گئی اور باچھوں کی قریبی قوسیں مستقیم ہو گئیں۔

وحید نے کہا "جب میں وہاں سے لوٹوں گا تو انگلستان چلیں گے اور پھر ساری عمر وہیں رہیں گے ——— اور اپنے ساتھ بابا کو بھی لے چلیں گے۔ لیکن اب تم فکر نہ کرو میں کون سے محاذ پر چلا ہوں جو تم اس طرح ملتجی ہو" اس نے اپنا چہرہ ایلن کی پیشانی اور بالوں پر رکھ دیا اور پیار سے رگڑنے لگا۔

ایلن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا "اب تم جا رہے ہو تو میرا دل گھٹتا ہے بل چلاتے تھے تو میرا دل کڑھتا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا تھا۔ تم ہیمپسٹڈ میں تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک ہی بار مجھے دکھائی دیتے اور میں پانچ قدم چلنے کے بعد تمہارے متعلق سوچنا بند کر دیتی۔ یا اگر تم مجھے بار بار ملتے تو تمہارا دل اس طرح کا نہ ہوتا اور اگر تمہارا دل اسی طرح کا ہوتا تھا تو قدرت مجھے عورت نہ بناتی۔ لیکن خیر! اب جو تم جا رہے ہو تو کبھی آؤ گے بھی، پر اتنے سارے دن میں مرغیوں اور بطخوں سے کھیل کر نہیں گذار سکتی۔ مسعود کی شکل تمہاری یاد کو اُبھارتی رہے گی اور بابا کی چال میں قدم قدم پر تم ٹہلتے نظر آؤ گے اور تمہاری غیر موجودگی میں تمہارے اس ہیولے سے کس طرح پیار کر سکوں گی؟ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر اُس ایکس۔ ای۔ این کا موٹر خراب نہ ہوتا اور ہم اس سے نہ ملتے"۔

وحید نے میز سے اتر کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور جب ایلن نے اس کی آنکھوں میں دور ایک ٹمٹماتی دیکھی تو وہ بے اختیار اُس کے ساتھ چمٹ گئی۔

اسٹیشن کے چھوٹے سے پھاٹک سے باہر نکل کر اُس نے ارد گرد دیکھا اور اُسے یُوں لگا جیسے کوئی اس کے دل میں مچھلی کا کانٹا چبھو کر پوری قوت سے کھینچ رہا ہے۔ چاروں طرف دُور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں خمیدہ درخت سر جھکائے کھڑے تھے اور نیلے آسمان سے پیلی پیلی روشنی اتر رہی تھی۔ موٹر میں بیٹھ کر جب اس نے سیلف دبایا تو ایک نظر ساتھ والی سیٹ کو دیکھا جس کی

گدی پر زور سے ہاتھ مارنے سے اسے یُوں محسوس ہوُا جیسے اس پیلی روشنی کا غبار اوپر اُچھلا ہے اور جیسے وحید کو اس سیٹ پر بیٹھے کتنے ہی سال گزر چکے ہیں۔

نہر کی پٹڑی پر جاتے ہوئے اُس نے ایک دیہاتی جوڑے کو پانی میں پاؤں لٹکائے دیکھا جو جان بُوجھ کر تیز میلی ہنسی ہنس رہے تھے۔ نہر کے دونوں کناروں پر گھاس اُگی ہوئی تھی مگر بعض جگہ ایک لمبا ٹکڑا بغیر گھاس کے بھی آجاتا جہاں مٹی کے بہت سے اَن گھڑت ڈھیلے پڑے ہوتے۔ اِن ڈھیلوں سے خاکستری فاختائیں شپیں شپیں کر کے اُڑتیں اور دُور دور درختوں کی طرف پرواز کر جاتیں ——

نہر کے بیلدار کی جھونپڑی کے پاس اُس نے موٹر روکی اور نہر کے کنارے جا بیٹھی۔ موٹے موٹے کھُردرے ڈھیلوں کے درمیان اُس نے چند بیلے بیلے ڈھیلوں کو دیکھا جن کی پیاس بُجھ چکی تھی اور جنھوں نے پانی کا ایک قطرہ بھی واپس نہر میں نہیں جانے دیا تھا۔ سیلابی زمین پر ہاتھ رکھ کر اُس نے سوچا کہ ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے وحید نے جاتے ہوئے یہاں مُنہ ہاتھ دھویا تھا اور ایک سگریٹ پیا تھا۔ اس جگہ نے وُہ پانی پی لیا۔ وحید یہاں سے بہت دُور ہو گیا۔ نہر کا پانی بہُت سا آگے نکل گیا اور جو پیچھے آرہا ہے وُہ اور آگے نکل جائے گا اور وحید اور دُور ہو جائے گا۔ سر پھیر کر اُس نے نہر کو دُور تک دیکھا اور یہ کہہ کر پھر موٹر میں آبیٹھی کہ جانے کے لیے پانی آرہا ہے۔

رات کو جب مسعود اس کے کمرے میں سونے آیا تو اُس نے دُکھی دل سے کہا "دیکھو، ماسود، تم ممی سے بالکل محبت نہیں کرتا۔"

"کرتا، ممی، کرتا!" مسعود نے ایلن کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا۔

"اچھا بتاؤ تم کو پاپا اچھا لگتا یا ممی؟"

مسعود سوچنے لگا۔

"جلدی بتاؤ، ماسود۔ نہیں تو ہم تم سے بولیں گے نہیں۔"

"ممی۔"

"اور پاپا؟"

"پاپا بھی۔"

"اور ڈاڈا؟"

"ڈاڈا بھی، ممی، ڈاڈا کہاں گئے ہیں؟"

"دُور گئے، ماسود ــــ تم ان سے اتنا پیار کیا کرو۔" اس نے باہیں کھول کر بتایا۔" اتنا! ڈاڈا سب سے اچھے۔ ممی اور بابا سے بھی۔ تمہارے کھلونوں سے بھی۔ تمہاری تیتریوں سے بھی۔ وُہ تمہارے لیے کھلونے لینے گئے ہیں۔ اچھے ہیں کہ نہیں ڈاڈا؟"

"ہاں ممی۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا اور پھر غور کرنے لگا کہ ڈاڈا ہمارے ساتھ رہتے رہتے ایک دم چلے کیوں گئے اور چلے گئے تو ہمیں کیوں یہاں چھوڑ گئے۔ ممی کے بغیر اب وُہ کھانا کس کے ساتھ کھائیں گے۔ اُجالا اور رچی کے بغیر وُہ ہل کیسے جوتیں گے اور رات کو کتنی کسے کیا کریں گے؟"

رات بھر وُہ اپنی ممی کے بازوؤں میں سو یا رہا جو ساری رات جاگ کر اُسے چومتی رہی اور مُنہ ہی مُنہ میں گیت، لوریاں اور نغمے گاتی رہی۔

صبح صبح بابا نے دروازے کو ٹھوکا۔ "مسعود جاگ گیا ہو تو اسے بوٹ پہنا دو۔ ایلن اور تم ناشتہ تیار کر لو۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔ بادلوں کی وجہ سے سُورج کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔"

ایلن خاموشی سے اُٹھی۔ کھونٹی سے ایپرن اتار کر باندھا اور پچھلا دروازہ کھول کر باورچی خانہ میں چلی گئی۔ جب مسعود گہری نیند سوتے دیکھا تو بابا دبے پاؤں باورچی خانہ میں جا کر حمام کے پاس کھڑا ہو گیا اور لجاجت سے بولا۔ "مسعود ابھی جاگا تو نہیں۔ لیکن دیر سے اُٹھنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیا میں اسے جگا کر کنوئیں پر لے جاؤں؟"

ایلن نے بھولپن سے کہا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں، بابا۔ مجھ سے اجازت مانگ رہے ہیں۔ اپنے بیٹے کو جگانے کے لیے دوسروں سے نہیں پوچھنا چاہیے۔"

"اچھا! اچھا!" بابا نے اس کی سعادت مندی سے خوش ہو کر کہا۔ "میں اسے کنوئیں پر لے جا رہا ہوں۔ آدھ گھنٹہ تک واپس آ جائیں گے۔ تم سب سے پہلے مسعود کے لیے دُودھ اُبال رکھو۔"

جب وُہ باورچی خانہ سے باہر نکلا تو اس نے سوچا کہ ایلن واقعی اچھی لڑکی ہے۔ صرف میری وجہ سے مسعود کو زیادہ قریب نہیں رکھتی۔ ورنہ کون ماں ہے جو اپنے بیٹے کو نہ چاہے۔ "خدا کرے" اُس نے دل ہی دل میں دُعا دیتے ہوئے کہا۔ "اس دفعہ

بھی اس کے لڑکا ہی پیدا ہو اور وُہ اس ننھے سے جی بھر کے پیار کر سکے "۔

دن ایک دوسرے کے پیچھے خزاں کے پتّوں کی طرح گرتے چلے گئے۔ کھیتی پک کر تیار ہو گئی۔ فصل کاٹی گئی۔ کھلیان دُور دور تک پھیل گئے۔ تیتریوں نے ان میں جاکر انڈے بھی دے دیے اور مرغیاں موقع پاکر وہاں سے بھی رسد حاصل کرنے لگیں۔ ریڈ روڈ کے بچے مرغیاں بن گئے۔ جنلی کا بچھڑا اب کسی سے باندھا نہ جاتا تھا اور کاٹھیاواڑی گھوڑی اور اس کا بچھیرا سارا سارا دن ہری ہری دوب چرتے رہتے۔ بابا نے ایلین کو ہر قسم کا کام کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ چائے اور کھانا کملو کی بہن تیار کرتی جس کی تربیت بابا نے خود کی تھی۔ مسعود اب پھر بابا کے پاس سونے لگا تھا۔

ایلین صبح ٹوکری لے کر صرف مرغی خانے تک جاتی اور انڈے لے کر اور مرغیوں کے ڈربے صاف کر کے چلی آتی۔ وحید کا خط ہر ہفتے آتا تھا۔ ولایت سے جوڈی کی چٹھی آئی تھی کہ ہم سب مسعود کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ تم لوگ بہار کے شروع میں ہمارے پاس ضرور آؤ۔ ایلین نے اس خط کو بائبل میں سنبھال کر رکھا تھا اور ہر صبح اسے نکال کر ضرور پڑھتی تھی۔

صبح کھلیانوں کو گاہا جانا تھا اور کملو ساتھ کے گاؤں آدمی لینے گیا ہوا تھا۔ جب شام رات کی سرحدوں میں داخل ہو گئی اور کملو نہ آیا تو ایلین چپکے سے اُٹھی۔ بالٹی ہاتھ میں لٹکا کر اور چھوٹا سٹول بغل میں داب کر جنلی دوہنے طویلہ میں چلی گئی۔ اور جب اس نے دُودھ کی آخری بُوند نچوڑی تو بادل زور سے گرجا اور بارش کے چھینٹے ایک دم دیواروں سے سر مارنے لگے۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی وُہ باورچی خانہ میں پہنچی۔ دُودھ کو چولھے پر رکھا ہی تھا کہ ایسی موسلادھار بارش شروع ہوئی کہ پانی کمروں میں گھُسنے لگا۔ بابا اپنے کمرے سے ایلین کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں ٹخنے ٹخنے پانی دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ ایلین باورچی خانہ میں آگ کے سامنے سٹول پر خاموش بیٹھی تھی۔ اسے پانی اور بابا کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا۔ لیکن جب بابا نے چلّا کر اسے بُلایا تو وُہ ایک دم اُٹھی اور زمین پر پاؤں رکھتے ہی ہڑبڑا گئی۔ بابا نے بتایا کہ باہر شدّت کی بارش ہو رہی ہے اور پانی اندر گھُسا چلا آتا ہے۔ اگر اس کا بندوبست نہ کیا گیا تو زمین پر پڑی ہوئی تمام چیزوں کو بہا کر لے جائے گا۔ جب انھوں نے باورچی خانہ سے باہر قدم رکھا تو پانی پنڈلیوں تک پہنچ چکا تھا۔ تب بابا

نے کہا۔ "نہر ٹوٹ گئی ہے، ایلن۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مسعود کو اُٹھا کر اصطبل بھاگ چلو۔"

مسعود کو جگا کر ایلن نے اُسے بابا کے کندھوں پر سوار کرا دیا اور خود الماری سے دو تین کمبل اُٹھا کر مُرغی خانہ کو بھاگ گئی اور جب ٹوکرے میں چند مرغیاں اور اُن کے بچے اُٹھا کر اصطبل میں پہنچی تو پانی اس کی بغلوں تک پہنچ گیا تھا۔ اسے اس بُری طرح بھیگی ہوئی دیکھ کر بابا نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے نہر میل آدھ میل لمبی ایک طرف ہی ٹوٹ کر بہہ گئی ہے ——— لیکن تم یہ کپڑے اُتار دو اور کمبل لپیٹ لو۔"

ایلن نے ایک کمبل کونے میں بابا اور مسعود کے لیے بچھا دیا اور دوسرا اپنے گرد لپیٹ کر کپڑے اُتار نے ہی لگی تھی کہ چنبلی کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ وُہ زور زور سے ڈکراتی ہوئی اصطبل کی طرف تیرتی آ رہی تھی۔ ایلن نے ایک دم کہا۔ "بابا چنبلی کا بچھڑا کھونٹے سے بندھا رہ گیا ——— اُسے تیرنا آتا ہے؟"

بابا نے منہ پھاڑ کر کہا۔ "نہیں۔"

ایلن کمبل پرے پھینک کر اصطبل سے باہر بھاگ گئی۔ اس کے پیچھے بابا کی دو تین آوازیں گونجیں لیکن وُہ طوفانی رات کے اندھیارے سینے میں گھستی چلی گئی۔ چنبلی اب بھی ڈکرا رہی تھی اور ایلن کو پانی میں تیرتے دیکھ کر اس کی آواز میں اور کرب پیدا ہو گیا تھا۔ بارش کی شدت کم نہ ہوئی تھی اور پانی سمندری لہروں کی طرح اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ ایسی اندھیری رات میں کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ وُہ اندازے لگاتی عین اس جگہ پہنچ گئی۔ جہاں بہت سے بھنور پیدا ہو رہے تھے۔ جب اس نے آگے بڑھنے کے لیے زور سے پاؤں مارا تو اس کا پنجہ بچھڑے کی تھوتھنی پر لگا۔ وہیں سے غوطہ لگا کر وُہ کھونٹے تک پہنچ گئی مگر زنجیر نہ کھول سکی۔ دوسری مرتبہ زیادہ گہری ڈبکی مار کر اس نے پانی کے اندر ہی اندر زنجیر کھولی اور بچھڑے کو آزاد کر دیا۔

اتنا عرصہ پانی میں رہنے کے باعث اُس کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ مہیب اندھیرے میں ادھر اُدھر چکر کاٹنے سے بالکل تھک گئی تھی اور اب اُسے راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے اینٹھے ہوئے بازوؤں کو ہلا ہلا کر وُہ جھیل عبور کی اور اصطبل کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ سارا لباس بھیگ کر تر ابور ہو رہا تھا۔ بال مسلسل غوطوں کی وجہ سے کھل کر گردن اور چہرے کے اِرد گرد لپیٹ گئے تھے۔ بابا

اصطبل کے دروازے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اس حالت میں آتے دیکھ کر اس نے غصّہ اور نفرت کے ملے جُلے کلمات منہ ہی مُنہ میں بڑبڑائے اور پھر اندر آ گیا چھوٹے سے دیئے کی مدھم لو میں ایلن نے اپنے گرد کمبل لپیٹا اور بھیگے ہوئے کپڑے پرے کونے میں پھینک دیے۔ جب وہ دیوار کے ساتھ پیال کے ایک ڈھیر کو پاؤں سے ہموار کر کے لیٹ گئی تو پچی اور بابا نے سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور دیر تک دیکھنے سے بابا کا غصّہ آہستہ آہستہ فرو ہو رہا تھا اور جب تقریباً دو گھنٹے گذر گئے تو اس کا دل بالکل صاف ہو گیا۔ سر کے نیچے پڑی ہوئی پگڑی کی لپیٹوں کو کھول کر اُس نے خشک حصّہ نکالا اور آہستہ سے ایلن کے سرہانے جا کر اس کے بھیگے ہوئے سر کو پُونچھنے لگا۔ ایلن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "آپ سو جائیں، بابا۔ میں ٹھیک ہوں، بال اپنے آپ خشک ہو جائیں گے" مگر بابا نے کچھ نہ سُنا اور سر کا ایک ایک بال پونچھنے میں لگا رہا۔ جب اس کا ہاتھ ایلن کے ماتھے کو لگا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے شدید بخار ہے۔

دن نکلا۔ نہر بند کر دی گئی اور پانی دُور دُور تک پھیل کر زمین میں جذب ہو گیا۔ دھوپ کی تمازت سے دم گھونٹنے والے بخارات پیدا ہوئے اور ایلن اصطبل میں آہستہ آہستہ کراہنے لگی مسعود اپنے کمرے میں اپنے کھلونوں کو دیکھنے چلا گیا اور بابا ضروری ضروری چیزیں نیچے سے اُٹھا کر اپنے اصطبل میں لاتا رہا۔ تمام ٹرنک اور بستر رات بھر پانی میں ڈوبے رہے تھے۔ چارپائیاں تیر تیر کر دُور نکل گئی تھیں اور دودھ کی خالی گاگریں دو میل پرے کے ایک گاؤں کے راستہ میں چلی گئی تھیں۔ بابا نے کونے میں پڑا ہوا ایلن کا لباس اُٹھایا اور کنوئیں پر دھونے چلا گیا۔ کمالو اور اس کی بہن کا پتہ نہ ملا۔ اُن کا کوارٹر ڈھے چکا تھا اور اس کے اردگرد مرغیاں مری پڑی تھیں۔

دُودھ میں دارچینی اور الائچی اُبال کر بابا نے ایلن کو ایک گلاس بھر کر دیا مگر وُہ دو گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکی۔ چینی کی ایک چھوٹی سی تھالی میں اس نے سیب کا مُربّہ ڈال کر دیا مگر اس نے آدھی قاش سے زیادہ نہ کھایا اور ہولے ہولے کراہتی اور جھوٹ موٹ مسکراتی پھر پیال پر لیٹ گئی۔

وُہ بیمار تھی۔ مسعود اکیلا تھا اور گھر پر کوئی موجود نہ تھا۔ بابا شہر کس طرح جاتا اور

کس کی مدد تلاش کرتا۔ دیر تک وہ اصطبل کے باہر بیٹھا یہی سوچتا رہا۔ مسعود ٹیلے پر چڑھتی ہوئی بیر بہوٹیاں جمع کر رہا تھا۔ اندر ایلن درد سے بیتاب ہو رہی تھی اور بابا اپنی سفید داڑھی کے بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ سولجر بورڈ جائے، ہسپتال پہنچے، ساتھ کے گاؤں سے آدمی بلا کر لائے —— مگر جائے کیسے؟ ایلن کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ جانا نہیں چاہتا تھا اور قریبی گاؤں سے مدد نہیں مل سکتی تھی کیونکہ سیلاب کی وجہ سے سارا گاؤں خالی ہو گیا تھا۔ سورج غروب ہونا جا رہا تھا اور پہاڑ سی رات سر پر کھڑی تھی۔ باورچی خانہ میں جا کر اس نے ایک انڈا ابالا، چائے تیار کی اور ایلن کے پاس لے آیا۔ خوشامدوں اور منتوں کے بعد اس نے تھوڑا سا انڈا کھایا اور ایک گھونٹ چائے پی کر "بس بابا" کہتی پھر اسی طرح لیٹ گئی۔

رات پھر بادل چھائے ہوئے تھے اور دور کہیں بارش بھی ہو رہی تھی۔ بابا مرغی خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھا اصطبل کے روشندان میں ہلکی ہلکی روشنی دیکھ رہا تھا۔ تفکرات سے اس کے ماتھے اور گالوں پر جھریوں کا ایک سیلاب امڈ آیا تھا۔ اصطبل کی ڈھلوان چھت کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں پر زور دیا اور بھوؤں کے درمیان بہت سی شکنیں ڈال کر اس نے سوچا۔ اگر ایلن کو کچھ ہو گیا تو۔ . . . لیکن پھر اس نے فوراً اس منحوس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا اور اٹھ کر آہستہ آہستہ اصطبل کو چلا۔ دروازے کے باہر پہیوں والے کھٹولے میں مسعود سو رہا تھا اور اس کے نیچے بطخیں اور مرغیاں بیٹھی تھیں۔ دہلیز پر اجالا کی لگام گری پڑی تھی۔ بابا نے آہستہ سے اسے اٹھایا اور پھر کھونٹی پر ڈال دیا۔ اندر دونوں گھوڑے منہ اٹھائے خاموش کھڑے تھے اور اپنے کانوں کو ہر آنے والی آہٹ کی طرف تیزی سے پھیر لیتے تھے۔

پیال کے بہت سے تنکے ایلن کے بالوں اور گالوں پر چپکے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بابا نے مسعود کا کھٹولا ہولے سے دھکیل کر اندر کر دیا۔ کھونٹی سے لگام اتاری۔ اجالا پر زین کسی اور رات کے اندھیرے میں اس پر سوار ہو کر شہر روانہ ہو گیا۔ مرغیاں کرلائیں، بطخوں نے جھک جھک کی اور پھر خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔

کوئی نرس، ڈاکٹر یا سسٹر اس کے ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ بابا نے کہا "میں

بہت دُکھیا ہوں، میرا ایک ہی بیٹا ہے اور اس کی بیوی اس کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔ خُدا کے لیے میرے ساتھ چلو۔ میں ہر ممکن طریق سے آپ کی خدمت کروں گا۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ مجھ پر اعتبار کیجیے۔ میں ایسا آدمی نہیں۔ میں پچھلی جنگ میں ہر محاذ پر لڑ چکا ہوں۔ میرا بیٹا بھی فوج میں ہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں۔ گھر چل کر میں آپ کو اپنا ڈسچارج سرٹیفکیٹ اور انگریز افسروں سے ملی ہوئی چال چلن کی چھٹیاں دکھاؤں گا۔ خدا کے لیے میرے ساتھ چلیے۔"

مگر سب نرسیں ہنسنے لگیں۔ ایک نے آنکھیں مٹکا کر کہا "بابا ہمیں تمھارے چال چلن پر اعتبار ہے۔ لیکن ہم لوگ یہاں سے باہر نہیں جا سکتے اور اگر جانا بھی ہو تو اس پر بیٹھ کر ہرگز نہیں۔" اُس نے اُجالا کی طرف اشارہ کیا اور تیزی سے آنکھیں جھپکنے لگی۔

بابا نے کہا "آپ کوئی موٹر لے لیجیے ٹیکسی لے لیجیے میں کرایہ ادا کر دوں گا۔ دوگنا کرایہ دوں گا۔ آپ کو دس گنا فیس دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔ مگر میرے ساتھ ضرور چلیے۔ میری بہو کو بچا لیجیے۔"

"نا بابا نا" دو تین نرسوں نے یک زبان ہو کر کہا "جب ڈاکٹر لوگ نہیں جاتے تو ہم کیا کریں۔" پھر اسی نرس نے کہا "بابا اپنی بہو کو جا کر دم کر دو۔ اچھی ہو جائے گی۔" اور ساری نرسیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اندھیری وادی میں اُجالا کو دوڑاتے ہوئے ایک آنسو کرن کی طرح اُس کی آنکھ سے ٹپکا اور داڑھی کی سفیدی میں جا ملا۔

واپس پہنچ کر وہ گھوڑے کی پیٹھ سے کُود کر اچھلا اور اصطبل کی گھاٹی پر تیز تیز چڑھنے لگا۔ اندر جا کر اُس نے دیکھا کہ پیال کے اور تنکے ایلن کے بالوں اور گالوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اپنی ایک مٹھی گلے کے پاس بھینچ رکھی ہے اور سانس کی دھونکنی چلنی بند ہو چکی ہے۔ بابا نے دوزانو ہو کر اس کی ناک سے کان لگایا۔ کوئی آواز نہ تھی۔ اس کا ماتھا چھوا جو برف کی طرح یخ تھا۔ بابا کو محسوس ہوا جیسے بہت سی سسکیاں اور آہیں کمرے میں گھوم رہی ہوں۔ جن میں بابا، بابا کی پکاریں کثرت سے ہیں۔ اس نے بڑی نرمی سے ایلن کی مٹھی کو کھولا۔ سونے کی ننھی سی صلیب مدھم روشنی میں جگمگانے کی کوشش کرنے لگی۔ جب بابا اس کے ابریشمی بالوں اور ساٹن ایسے ملائم چہرے سے پیال کے تنکے چُن رہا تھا تو اُجالا خاموشی سے اندر داخل ہُوا اور اپنے تھان پر جا کر

چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

رات رات میں بابا نے خود ہی قبر تیار کی اور رابلین کو اسی کمبل میں لپیٹ کر لحد میں اتار دیا۔ پھر دیا اُٹھا کر مسعود کی کھاٹ کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور تلاوت کرنے لگا۔

صُبح جب مسعود نے پوچھا "ممی کہاں ہے"؟ تو بابا نے جواب دیا کہ "تمھارے ڈاڈا آئے تھے اور ممی کو ساتھ لے گئے۔ اب وہ اگلے مہینے دونوں اکٹھے آئیں گے"۔

مسعود بسورنے لگا کہ "ڈاڈا آئے تھے تو مجھے کیوں نہ جگایا۔ ممی کو اکیلے کیوں جانے دیا۔ مجھے ساتھ لے کر کیوں نہ گئے"۔ اور جب بسورنے سے رونے پر اُتر آیا تو بابا نے اُسے اُٹھا کر کندھوں پر بٹھا لیا اور بولا "چل تجھے نیلی چڑیا پکڑ دوں"۔

"جلدی کرو! جلدی کرو"۔ سپاہی نے ایک بڑھیا کی کمر میں رائفل سے زور کا ٹھوکا دیا۔ اور اُس کے سر پر رکھی ہوئی ٹرنکی زمین پر گر گئی اور وہ ایک نوجوان سے جا بھڑی اور ریلے کے پاؤں تلے اس کی ٹرنکی آہستہ آہستہ ٹین کا ایک چپٹا ٹکڑا بن گئی ——— دکانوں کے تالے ٹوٹے پڑے تھے اور بہت سے کواڑوں کو قلابوں سے اُکھیڑ لیا گیا تھا۔ دکانوں کے اندر اور باہر خالی ڈبوں اور بوریوں کے انبار لگے تھے۔ اندر اندھیرا تھا اور باہر مٹیالی گرد سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتی سورج کے گرد منڈلا رہی تھی . . . . خاک کے ذرّات چنگاریوں کی طرح گرم اور نیزے کی انیوں کی طرح نوکیلے، پسینے سے تر جسموں میں نشتروں کی طرح اُترتے چلے جا رہے تھے۔ اس پر رائفلوں کی سیٹیاں بجاتی گولیاں اور سٹین گنوں کی تڑتڑ کرتی باڑھیں! انسان تھے سانس روکے سب برداشت کرتے گئے۔ بچے پیاس کی شدت سے چلّا رہے تھے۔ ان کی ماؤں کا ایک ہاتھ ان کے منہ پر بھنچا ہوا تھا۔ دوسرا برقعہ سنبھال رہا تھا۔

تیزی! تیزی!! تیزی!!! بندوقوں کے فائر تیز۔ کوٹھوں سے اینٹوں کی بارش تیز اور گالیوں کی بوچھاڑیں تیز۔ مشرقی پنجاب سے مہاجروں کا یہ قافلہ سڑک میں گٹھڑیاں ٹرنک، جوتے، برقعے اور بٹوے بوتا ہوا اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک سفید رنگ کی بوٹا سی لڑکی سر پر سیاہ ٹرنک اُٹھائے ہانپتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ خوف اسے تیز قدم اُٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ یوں ننگے سر ننگے مُنہ بازار چلنے کا احساس دل کی تیزی کے ساتھ نتھنوں کے اتار چڑھاؤ میں عجلت پیدا کر رہا تھا۔

جانے پہچانے حلوائی نے اس کے قریب آ کر کہا "تیرے صدقے جاؤں،

کتنا بھاری ٹرنک اُٹھا رکھا ہے —— جانی ایسا بھی کیا۔ لا یہ ٹرنک مجھے دے۔ دیکھ تیری چھاتیاں تالیاں بجا رہی ہیں۔"

لڑکی لڑکھڑائی، ٹرنک کا کونا اُس کی کنپٹی میں لگا۔ خون کے قطرے ایک دوسرے کے پیچھے سُرعت سے بھاگنے لگے۔

"ہائے ہائے!" بلوائی نے سر جھلا کر کہا "یہ ناریں بھی کسی بلور سے بنی ہیں۔ ذرا سا بال آگیا۔ اور مالٹا مشقہ کی بوتل کی طرح چھلکنے لگیں۔ ہائے رسیلی۔ رس بھری" اور پھر وہ اپنے ہونٹ چاٹنے لگا۔

بابا مسعود کو پیٹھ پر لادے جلدی جلدی قدم اُٹھا رہا تھا۔ پسینہ کے قطرے اس کی سفید داڑھی سے ٹپکنے لگے۔ مسعود کے لٹکتے ہوئے پاؤں اس کی چرچراتی ہڈیوں سے ٹکرا رہے تھے اور وہ بوڑھے اُونٹ کی طرح ہَف ہَف کرتا بھاگ رہا تھا۔ دوڑ ختم نہ ہوتی تھی۔ راستہ کٹ نہیں رہا تھا اور اس کا سُرخ و سپید پوتا ہولے ہولے رو رہا تھا۔ سبز رنگ کا کوٹ پہنے، نیلی نیلی آنکھوں والا فرنگی باوا! اس کا باپ العرفہ کے کیمپ پوسٹ آفس سے تار بھجوا رہا ہوگا اور اس کا بابا اپنے خاندان کی واحد امانت کو اپنے ان بوڑھوں کندھوں پر اُٹھائے لیے جا رہا تھا جن کو دُشمن کی سنگینوں نے کئی مرتبہ چُوما تھا۔

پلیٹ فارم پر بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی مگر گاڑی نہ آئی۔ بلوائیوں کا ایک گروہ نیزے چمکاتا اور بلمیں گھماتا اسٹیشن کے پہلو سے گذر گیا۔ ان میں بہت سے گا رہے تھے، بہت سے گالیاں دے رہے تھے اور باقی بوک بکروں کی طرح آوازیں نکال رہے تھے۔ عورتیں زانوؤں میں سر دے کر بیٹھ گئے اور مرد آنکھیں مُوند کر کھڑے ہو گئے۔ روشنی میں کچلے کا غبار سا تیر رہا تھا اور افق کے پاس نارنجی رنگ میں اجلی اجلی آگ کروٹیں لے رہی تھی۔

مسعود نے کہا "بابا، مجھے پیاس لگی ہے۔"

بابا نے چمکار کر کہا "ابھی پلاتے ہیں پانی، گاڑی آئے گی تو پانی ملے گا۔"

"گاڑی کب آئے گی، بابا؟"

"ابھی آئے گی۔" اس نے مسعود کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور اس کے سنہرے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

ایک اور ہجوم "بجرنگ بلی" کے نعرے لگا کر پلیٹ فارم کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر پہلا گروہ پلٹ آیا۔ کسی کے حکم کا انتظار نہ تھا۔ چیخیں گونجیں۔ شور اٹھا۔ آسمان لرزنے لگا اور نارنجی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔ کوئی جھاڑیوں کو بھاگا۔ کسی نے مکانوں کا رُخ کیا۔ بہُت سے دریا کو دوڑے اور جو باقی تھے وُہ کٹنے لگے۔ خون کی چکناہٹ سے سپاہیوں کے قدم اچھی طرح جم نہ سکتے تھے اور ان کے لوہے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اُٹھتے تھے۔ دریا کے پاس زمین اب بھی پھسلنی تھی اور مخالف ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ لیکن ان کے ارادے مضبوط تھے۔ ہاتھ گو شل ہو چکے تھے پر جذبہ جوان تھا۔

مسعود ریلے کی ٹھوکر سے بنچ کے نیچے جا گرا اور اس کا سر لوہے کے ایک بڑے بنچ سے بُری طرح ٹکرایا۔ بابا کے پُرشکن ماتھے پر ایک اور گہرا نشیب نمودار ہوا۔ اس کی سفید داڑھی کو پھر حنا ملی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔ اس کی کمر کو ایک بار پھر سنگینوں نے چُوما اور اس کے کندھوں سے بہُت سے بوسے چمٹ گئے۔ تاریکی پھیل گئی۔ پلیٹ فارم پر خاموشی چھائی اور تیز ہوا چلنے لگی۔ شیشم کے درخت خاموشی میں سرسرائے۔ فوجیں جا چکی تھیں۔ انھیں شبخون سے نفرت تھی اور گوریلا لڑائی ان کے نزدیک بے حد بُزدلانہ فعل تھا —— سارا دشمن کھیت رہا تھا۔ اس کی عورتیں سپاہی اپنے ساتھ لے گئے تھے —— دُور سگنل کی سبز آنکھ جگمگا رہی تھی۔ شیشم کے درخت سے ہڑ ہڑ کرتا ایک اُلّو نار دل میں اُلجھا وُہ کھیتوں کی طرف اُڑ گیا۔ کرفیو لگ چکا تھا اور آوارہ کُتّے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے تھے۔ اس مسلسل سکوت میں ایک ہلکی سی گونج تھی جو ٹوٹے ہوئے عضو کی طرح جھنجھنا رہی تھی۔

مسعود بنچ کے نیچے سے نکلا۔ اس کے آس پاس بہُت سے آدمی لیٹے تھے اور انہی میں ایک اس کا بابا بھی تھا۔

"مجھے پیاس لگی ہے، بابا!" اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

"——"

"مجھے پیاس ——" پھر اُس نے اپنے بابا کا کندھا ہلایا۔ پر وُہ نہ بولا۔ ویسے ہی لیٹا رہا۔ مسعود رونے لگا۔ "بابا! بابا!" اس نے چیخ کر کہا۔ "مجھے پیاس لگی ہے، بابا!"

دُور کہیں بندوق دغی اور اس کی ٹھائیں دیر تک قہقہے مارتی رہی۔ وُہ دبک کر

اپنے بابا کے پاس بیٹھ گیا۔ سارے آدمی چپ چاپ سو رہے تھے۔ پلیٹ فارم کے پرلے کونے پر ایک زرد سا بلب جل رہا تھا۔ ریلوے لائن مرے ہوئے اژدہوں کی طرح بے حس لیٹی تھی۔ تیز ہوا سسکیاں بھرنے لگی تھی اور وہ خاموش اپنے بابا کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ سبز رنگ کا کوٹ پہنے نیلی نیلی آنکھوں والا فرنگی بادا۔ اس کا باپ دُور تھا۔ اس کی ممی بہت دُور اور اس کا بابا اور بھی دُور۔ ذرا جھک کر اس نے اپنے بابا کو دیکھا اور دیکھتا چلا گیا۔ اس کا ڈاڈا اسی رات ہی رات اس کی ممی کو لے گیا تھا۔

—— بابا بولتا نہیں تھا اور اس کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔

پناہیں

ٹوکن ہاتھ میں لے کر بوڑھا بنچ پر بیٹھ گیا۔ ابھی چیک پاس ہونے میں کافی دیر تھی۔ چونکہ چار ہندسوں کا چیک بنک کے ہر میز پر گھوم کر خزانچی کے پاس پہنچتا ہے —— اُس نے چوبیس نمبر کا ٹوکن واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ گھٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا اور سوچنے لگا کہ اگر آصف ساتھ ہوتا تو کام کتنی جلدی ہو جاتا اور اگر کام جلدی نہ بھی ہو سکتا تو اس دوران میں وُہ باتیں کر کے ہی یہ وقت گذار لیتے اور آصف اس کے ساتھ بھی آسکتا تھا اگر شام ذرا جلدی چھا جاتی یا وحید کوٹھے کی اوٹ سے سر نکال کر نہ دیکھتا اور وحید ہرگز اونچا ہو کر نہ دیکھتا اگر شور اچانک بند نہ ہو جاتا۔ اگر عقل اس وقت اس کا ساتھ دیتی تو آصف یقیناً اس وقت بنک کے بنچ پر بیٹھا ہوا ٹوکن نمبر چوبیس کے چیک کی رقم کا انتظار کرتا۔ وحید نے غلطی کی تھی۔ آصف نے اس کا خمیازہ بھگتا تھا اور بوڑھا اس غلطی پر پریشان ہو رہا تھا۔ لیکن اگر آصف اس وقت یہاں ہوتا تو ان کے پاس یہ ٹوکن ہی نہ ہوتا!

بُوڑھے کی تابوت ایسی آنکھوں میں وُہ راتیں سائیں سائیں کر کے گھومنے لگیں جب ہری کیبن کی روشنی میں اناج والی کوٹھڑی کے اندر تین سائے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے۔ ایک جا قسے کارتوسوں کو چھیل کر بارود اور گولیاں الگ کرتا، دوسرا دو کارتوسوں کا بارود ایک میں ڈال کر پنکھی کی ڈنڈی سے کُوٹتا، پھر خاکی تھیلے سے سیسہ کی ایک گولی نکلتی اور اس کارتوس میں اتار دی جاتی۔ گتے کی گول ٹکیہ مُنہ بند کرتی اور اوپر لئی لگا کر پتنگی کا غذ منڈھ دیا جاتا۔ اس پُرسکون سازش میں تیسرا سایہ کاپی کی جلد سے آہستہ آہستہ ان دولوں کو ہوا کیے جاتا یا ان دونوں کی کنپٹیوں سے رِستے ہُوئے پسینہ کے قطرے کو اپنی سیدھی اُنگلی پر اُٹھاتا اور ہاتھ اونچا کر کے انگوٹھے کی مدد سے ہوا میں یُوں جھٹک دیتا جیسے طلسماتی بلور ہتھیلی پر دھرے دھرے ایک دھماکے سے کرچی کرچی ہو گیا ہو اور اگر اُمسی ہوئی خاموشی ان کے سانسوں کی آواز

کو بھی مفلوج کر دیتی تو بھی تیسرا سایہ کوئی تازہ بھرا ہُوا کارتوس اُٹھا کر کہتا "بیٹا آصف! شاید اس میں گولی ڈالنا بھول گئے" اس طرح اس قبرستانی سکوت میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہو جاتا جیسے خرابے کی ڈھیری پر سگنل کی سُرخ آنکھ سے کوئی اُلّو پھڑپھڑا کر کے اُڑ گیا ہو۔ آصف بڑی سنجیدگی سے وُہ کارتوس وحید کے آگے لڑھکا دیتا اور خود کھڑے زانو سے مُنہ کا پسینہ پُونچھ کر گولیاں گِننے لگتا۔ جب یہ کام ختم ہو چُکتا تو وُہ تینوں گندم کی ایک بوری سرکا کر سارا مواد اس کے پیچھے ڈال دیتے اور خود کپڑے جھاڑ کر باہر نکل آتے۔ دروازہ بند ہو جاتا۔ ہریکین کا شعلہ لحد میں اُتر جاتا اور وُہ آہستہ آہستہ قدم رکھتے باہر صحن میں پہنچ جاتے جہاں کچھ تو گھوک سوئے ہوتے اور باقی آخری کروٹیں بدل رہے ہوتے۔

وُہ دن بھی آ گیا جب بوریوں کو ایک طرف ہٹا کر سب کارتوس نکالے گئے اور انھیں مختلف تھیلیوں میں ڈال کر تقسیم کر دیا گیا۔ تین تھیلے وحید اپنے گھر لے گیا۔ دو تھیلے لے کر الٰہ دین بڑ کی اوٹ میں طویلے کی چھت پر لیٹ گیا اور جدھر آموں کے جھُنڈ تھے ادھر ریت کی دو بوریاں رکھ کر آصف نے مورچہ بنا لیا۔ وحید اپنے کوٹھے ——— پر سیڑھیوں والی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے چوڑا تھیں مار رہا تھا۔ یہ قدرتی ناکہ بندی سب سے اچھی رہی۔

حملہ بارہ بجے دوپہر شروع ہُوا۔ یلغار کرنے والی فوجیں آموں کے جھُنڈ سے نمودار ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر گھوڑوں پر سوار تھے جن کے پاس بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ باقی بلموں، نیزوں اور تلواروں سے مسلح نعرے مارتے چلے آتے تھے۔ گاؤں کو اس طرح خاموش دیکھ کر انھوں نے شاید یہی اندازہ لگایا کہ رہنے والے بھاگ گئے۔ مگر جب سامنے منڈیر پر رکھی ہوئی بوریوں میں سے ایک گولی لپکی اور سامنے والے سوار کا بھیجا چاٹتی ہوئی نکل گئی تو طوفان مچ گیا۔ جوابی فائر ہوئے۔ نعروں کی آوازیں توپوں کی گرج پیدا ہو گئی اور ٹاپوں کی دھول سے بہُت سے ہند دکش ایستادہ ہو گئے۔ لیکن ہر مرتبہ انہی کا کوئی سوار یا پیادہ ڈھیر رہا۔ کلمہ کی صدائیں گونجیں۔ خوفزدہ نعرے سیلاب ہوئے پٹاخوں کی طرح پھٹے اور عرش و فرش گویا کانپنے لگے۔ دُھوپ کی تمازت میں بھی چہرہ سرسوں کا پھُول بنتا جا رہا تھا اور سُورج کی شعلہ باری کانپتے ہوئے جسموں کو کنکنی پھوار معلوم ہوتی تھی۔

کچھ حملہ آور کنی کترا کر طویلے کی طرف گئے۔ آصف نے اللہ دین کو للکارا۔ ٹھسے فولادی بڑولیاں ٹکیں اور حملہ آور حلال خوروں کی جھونپڑیوں کے پیچھے چھپتے چھپاتے وحید کی زد میں آ گئے۔ دیوار کے پیچھے دونالی کا پھن اٹھا اور کالے نے آگے پیچھے دو من اُگل دیے۔ دھول کی دیوار بلند ہوئی اور جوگیوں نے بھی اگن بان پھینکنے شروع کیے جو دیوار سے سر پھوڑ پھوڑ کر رہ گئے۔

آصف کی بندوق متواتر دغنے سے اتنی گرم ہو گئی تھی کہ کارتوس مشکل سے بھرتا اور بڑی قباحت سے گھوڑا دبایا جاتا۔ ادھر بڑ کے پتّے بارش کی طرح برس رہے تھے صرف وحید آہستہ آہستہ نالی ادھر پھیرتا اور اطمینان سے سر دیوار سے ٹیک کر داغ دیتا۔ جب کافی دیر تک ادھر سے کوئی جوابی فائر نہ ہوا تو وحید نے آگے بڑھ کر دیوار کی اوٹ سے جھانکا۔ اس کی نگاہ پڑنے سے پہلے ایک گولی نے اس کی کنپٹی کو چوما اور وُہ بغیر کوئی آواز نکالے اسی جگہ لیٹ گیا۔ آصف نے گولی کی یہ انوکھی آواز سُن کر سر ادھر پھیرا اور اپنے پاس لیٹے ہوئے بوڑھے سے کہنے لگا "ابا آپ یہاں آ جائیں۔ میں وہاں جا رہا ہوں" اس نے وحید کے مورچے کی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن وحید۔ . . . ." اس کے باپ نے ایسے ہی لیٹے لیٹے ادھر آنکھیں گھما کر دیکھا اور پھر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رینگتے رینگتے وُہ چھتوں پر سے ہوتا ہوا ادھر پہنچا۔ مگر ابھی وُہ وحید کے کوٹھے پر چڑھ ہی رہا تھا کہ اسے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آنے لگی۔ دیوار پر چھائے ہوئے نیم کے سہارے لٹک کر وُہ اندر صحن میں کُود گیا۔ وحید کا باپ جو برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے دروازہ ٹوٹنے کا انتظار کر رہا تھا اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور شدت سے کانپنے لگا۔ آصف نے اُسے کلائی سے پکڑ کر کھینچا اور گاٹے کی کھُرلی کے پاس لے گیا۔ جس کے نیچے مُرغیوں کا ڈربہ تھا۔ تنگ دروازے سے اُسے اندر دھکیل کر آصف نے اُس کے آگے تختی ڈال دی۔ دروازہ ٹوٹ گیا اور وُہ اُچھل کر غسل خانے میں جا چھُپا۔ دوسرے مورچے بھی ٹوٹ گئے جو چیخیں پہلے آسمان میں شگاف کیے جاتی تھیں اب موت سامنے دیکھ کر ختم گئیں۔ البتہ لوہے سے لوہا بجنے کی صدا بہت بلند ہو گئی تھی۔

شاید حملہ آوروں کے اپنے ہتھیار آپس میں اُلجھ رہے تھے۔ آصف کے گھر میں جمع ہوئے لوگ پچھلے دروازے سے نکل بھاگے اور آموں کے جھُنڈ کے پاس لہلہاتی

مکئی کے کھیت میں چھُپ گئے۔ بوڑھے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مکئی کے ٹانڈوں کو الگ کر کے دُور تک دیکھا مگر آصف کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ وحید کا باپ جب رات کو ڈربے سے نکل کر بھاگا تو اس نے غسل خانے میں پڑی ہُوئی ایک لاش کو دیکھا ضرور مگر وُہ اسے پہچان نہیں سکا۔ لیکن آصف ابھی واپس بھی نہیں آیا تھا اور بوڑھا آج تک اس کا انتظار کر رہا تھا۔ . . . . پر یہ سب کُچھ وحید کی وجہ سے ہُوا۔ اگر وُہ کوٹھے کی منڈیر سے سر نکال کر نہ دیکھتا اور اگر شور بدستور جاری رہتا۔ اگر اللہ دین بہت سے آدمیوں کو مار دیتا یا اگر شام ذرا جلدی ہو جاتی تو آصف بھی بچ کر مکئی کے کھیت میں پہنچ جاتا۔ لیکن اگر اس کی ماں دُور اندیش عورت ہوتی تو وُہ اسے عید پر بلاتی ہی کیوں۔ دوسرے بچّوں کی طرح اُسے بھی مغربی پنجاب میں ہی رہنے دیتی۔ لیکن اگر وُہ ساری عمر اپنی ماں سے دُور دُور نہ رہتا تو یقیناً وُہ اسے عید پر نہ بلواتی۔ بار بار یہی خیال بوڑھے کے ذہن میں ایک اپاہج کی طرح ناچ رہا تھا۔

اُس نے دیکھا! آصف ہسپتال کی میز پر بیٹھا ٹانگیں جھُلا جھُلا کر تختی پر پہاڑے لکھ رہا ہے۔ ایک دُونی دُونی، دو دُونی چار اور جب وُہ ڈوبا لینے کے لیے دوات میں قلم ڈالتا تو ہندسوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اور لے سے پاؤں کی تال ملا کر دیر تک قلم دوات میں ہادن دستہ کا کھیل کھیلتا رہتا۔

اپنی بیوی سے بوڑھے کے تعلقات کچھ اتنے خوشگوار نہیں تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی نارضامندی کی شادی کا ایک تلخ ردِ عمل تھی۔ بوڑھا ایک کامیاب سلوتری تھا لیکن ایک ناکام خاوند! شادی سے لے کر آج تک اس کی بیوی کبھی ایک سال سے زیادہ اس کے پاس نہ رہ سکی۔ بیٹھے بٹھائے کوئی نہ کوئی ایسی بات چل نکلتی کہ فوراً تانگہ منگوایا جاتا اور بیگم صاحبہ کھڑے پاؤں میکے پہنچ جاتیں۔ بچّوں کو بھی اپنے باپ سے وُہ الفت نہ رہی تھی۔ پھر اُٹھتے بیٹھتے ماں کے مُنہ سے ابا کے خلاف ایسی باتیں سُنتے سُنتے انھیں اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ان کے کچھ بھی نہیں لگتے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب بھی دن بھر مویشیوں سے سر پھوڑ کر شام کو آرام کرسی میں لیٹ کر اخبار پڑھتے ہوئے ہولے ہولے حقّہ بجانے لگتے اور سوائے اپنے گھر کے دُنیا کے ہر حِصّہ کا جائزہ لیتے رہتے۔ ایسی ہی ایک شام رحیم بخش نے ہسپتال میں داخل شُدہ

گھوڑوں پر کھریرا کر کے پگڑی کے پلو سے مُنہ صاف کیا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس آ کر کھنکار کر بولا۔

"ڈاکٹر صاحب، چار دن کی چھٹی چاہیے۔"

"چار دن کی چھٹی!" ڈاکٹر صاحب نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے پُوچھا۔ "کیوں خیر تو ہے؟"

"گھر جاؤں گا، ڈاکٹر صاحب۔"

"گھر جاؤ گے؟" ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ "وہاں کیا رکھا ہے؟"

"عید آ رہی ہے، ڈاکٹر صاحب ——— اور بال بچّوں سے پرے عید کون مناتا ہے جی۔"

"اچھا! اچھا! چلے جانا ——— لیکن ..... اچھا چلے جانا۔" ڈاکٹر صاحب نے جلدی سے کہا اور تیزی سے حقّہ بجانے لگے۔

انھیں بچوں سے ملے تیسرا سال جا رہا تھا۔ تنخواہ ماہ بماہ بھجوا دیتے لیکن خود کبھی نہ گئے نہ خط لکھا۔ سرِ شام ہی سونے کی عادت تھی اس لیے بال بچّوں کی یاد کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اب رحیم بخش نے جو یہ بات کہی تو ڈاکٹر صاحب کو ایک دم سارے لوگ یاد آ گئے اور وُہ ڈریننگ اخبار زانو پر ڈالے ان کے متعلق سوچ سوچ کر ساکت ہوتے گئے۔

رحیم بخش کی عرضی منظور ہو گئی اور ڈاکٹر صاحب خود بھی کمپاؤنڈر سے یہ کہہ کر روانہ ہو گئے کہ عید کے بعد آؤں گا۔

آصف اب چار برس کا تھا۔ وُہ دوسرے بھائیوں کی طرح ابّا سے خائف نہیں ہوُا۔ جتنے دن وُہ وہاں رہے یہ سایہ کی طرح ان سے چمٹا رہا۔ چلتے وقت رونے لگا کہ میں بھی ابّا کے ساتھ جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب رضامند ہو گئے۔ اس ماں نے بھی مزاحمت نہ کی۔ کرتی بھی کیسے جو بچّہ باپ پر اس قدر التفات کرتا ہو وُہ اس کی پارٹی کا کیسے ہو سکتا تھا۔

ہسپتال پہنچ کر آصف بہت خوش ہوُا۔ دن بھر طرح طرح کے مویشی دیکھنا، ان کی بے ہنگم آوازیں سُننا اور سانپے ابّا کو اتنا سارا خون بہاتے دیکھ کر حیران بھی ضرور ہوتا۔ دوپہر کو کمپاؤنڈر کا لڑکا اسلم اور وُہ گھڑونجی سے سیلی سیلی ریت نکال کر اور

اپنا پاؤں اس میں ڈال کر دیر تک تھپتھپاتے رہتے۔ اس کے پاؤں کھینچا جاتا اور اللہ میاں کی گھوڑی بن جاتی۔ پھر وہ اسکیمو خانہ طرح طرح کی چیزوں سے سجایا جاتا۔ جن میں بوتلوں کے کارک اور گتّے کی ڈبیاں کثرت سے ہوتیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا سا تنکا ہوا میں لہراتا اور گھوڑی کی پیٹھ پر پڑتے ہی صدا نکلتی "تیری گھوڑی پھُس" اور پھُس گھوڑی کا مالک اپنی خانہ بربادی کا خیال کیے بغیر دوسرے کی گھوڑی پھُس کر دیتا۔ پھر ریت سے ایک مشترکہ گھر کی تعمیر ہوتی۔ جس کے باہر بہت کھُلا صحن ہوتا۔ اس صحن میں باغ اور نہانے کا تالاب ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے بیسیوں کمرے بنتے جن کے درمیان ایک بڑا ہال ہوتا۔ باغ کے ایک طرف گھاس کے میدان میں بھینس، گھوڑے اور اونٹ باندھ دیے جاتے۔ دروازے کے ساتھ ایک موٹر گراج ہوتا جس میں ایک چھوٹا سا کارک ڈال دیا جاتا۔ کمروں میں جھاڑو کے چھوٹے چھوٹے تنکوں کو گاڑ کر آدمی بنا دیے جاتے جو نہایت مہذّب ہوتے اور دُور دُور کھڑے ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہتے۔ جب یہ سب کچھ ہو چکتا تو وہ دونوں ایک دم کھڑے ہو جاتے اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اس مکان کی دیواریں الانگ جاتے۔ پھر پاؤں کے تلووں میں شدّت کی کھُجلی اٹھتی لبوں پر یہ قومی ترانہ پھڑکنے لگتا۔

ہاتھوں سے بنایا تھا — پاؤں سے مِٹایا ہے

اور سارا گھر ذرّہ ذرّہ ہو کر دُور دُور تک پھیل جاتا۔ اس اثنا میں اگر کمپونڈر صاحب اچانک ادھر سے گزرتے تو اپنے بیٹے کے سر پر تین چار تھپڑ مار کر آصف سے کہتے۔ "ڈاکٹر صاحب کو بتاؤں گا" تو آصف اپنے دوست کی بے عزّتی دیکھ کر انھیں واحد حاضر کے صیغہ سے مخاطب کر کے ٹھینگا دکھاتا "جا کہہ دے۔ ایک دفعہ چھوڑ کے سو دفعہ کہہ دے۔ ہم کوئی تیرے باندھے تھوڑی ہیں"۔

لیکن کمپاؤنڈر صاحب کبھی نہ کہتے۔

شام کو وہ اسلم کے کوارٹر میں اس کی امّی کے پاس چلا جاتا اور چولھے کے پاس بیٹھ کر اس کی کہانیاں سُنا کرتا۔ وہ مذہبی قسم کی عورت تھی۔ جن پریوں کی کوئی کہانی اُسے نہ آتی تھی۔ پیغمبروں اور بزرگوں کے قِصّے سُناتی رہتی۔ وہ رات گئے تک انہی کے یہاں بیٹھا رہتا۔ ڈاکٹر صاحب اس دوران میں سو جاتے۔ رحیم بخش دودھ میں جامن ڈال کر حقّہ گڑگڑاتا کمپاؤنڈر صاحب کے کوارٹر کے آگے جا بیٹھتا اور ہر پندرہ

بیس منٹ بعد ہانک لگاتا "آصف میاں، اب آجاؤ"۔

لیکن آصف میاں "اچھا" کہہ کر جُوں کے توں اسی جگہ بیٹھے رہتے۔ رات گئے جب اسلم کی امّی سونے لگتیں تو وُہ چمکار کر اسے بھی باہر بھیج دیتیں۔

جس دن اسلم سکول داخل ہو گیا آصف کے لیے ساری دنیا گویا تاریک ہو گئی ابّا سے کہہ سُن کر اُس نے بھی اسلم کے ساتھ سکول جانا شروع کر دیا۔ دن رات کی اس بے طرح دوستی نے ہنگاموں میں اور اضافہ کر دیا اور ہسپتال میں وُہ دھما چوکڑی مچی کہ سب لوگ تنگ آ گئے مگر ڈاکٹر صاحب اس ہلڑ سے اُکتائے نہیں۔ ان کی طبیعت نفاست پسند اور امن طلب ضرور تھی مگر آصف سے کچھ کہنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ ایک تو شاید اس وجہ سے کہ پیٹ پونچھن تھی، دوسرے اس لیے کہ خانہ جنگی میں اُس نے ہوم گورنمنٹ کا ساتھ نہ دیا تھا۔

ہسپتال میں کوئی بوتل ایسی نہ تھی جس کا کارک نہ اُترا ہو۔ کوئی پچکاری ایسی نہیں تھی جس میں لال نیلا رنگ بھر کر نہ چھوڑا گیا ہو اور گتے کی چھوٹی چھوٹی ڈبیاں تو گویا اسی لیے تھیں کہ انھیں لڑھکا کر مویشیوں کے کھُروں تلے پہنچا کر تماشا دیکھا جائے۔ خود ڈاکٹر صاحب کی عینک کا شیشہ دو دفعہ ٹوٹ چکا تھا۔ ان کا پن جسے گوند سے تھبڑ کر لکھنے کی کوشش کی گئی تھی اب نہ تو روشنائی کھینچتا تھا اور نہ لکھتا تھا لپٹے ہوئے بستروں پر روزانہ سواری ہوتی اور انھیں پچکا کر تکیہ بنا دیا جاتا۔ دونوں رحیم بخش سے ضرور ڈرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب کی ایک بھی نہ مانتے تھے۔ وُہ ان کے سامنے سارے کھیل کھیلتے، زور زور سے ہنستے، شور مچاتے اور قلابازیاں لگاتے۔ پھر ڈاکٹر صاحب انھیں روکتے کیسے!

مہینہ کے آغاز پر رحیم بخش ڈاکٹر صاحب کی تنخواہ لے کر ان کی بیوی کو دینے جایا کرتا۔ اس دفعہ جو وُہ جانے لگا تو آصف بھی مچل گیا کہ میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سمجھایا، لالچ بھی دیا مگر وُہ نہیں مانا۔ یہی کہتا رہا "میں اماں کے پاس جا کر پڑھوں گا۔" ناچار بھیجنا پڑا۔ تیسرے دن جب رحیم بخش واپس پلٹنے لگا تو آصف نے اپنی اماں سے کہا "میں اپنے ابّا کے پاس جاؤں گا اور اپنے دوست سے کھیلوں گا اور وہیں پڑھوں گا۔" اس نے روکا نہیں اور رحیم بخش کے ساتھ سوار کرا دیا۔ ڈاکٹر صاحب نیم کے تلے بیٹھے پرچیاں کاٹ رہے تھے۔ انھوں نے دُور سے رحیم بخش

کو گھوڑے پر آتے دیکھا۔ آج خلافِ معمول رحیم بخش گھوڑا قدم قدم چلا رہا تھا۔ ہسپتال سے تھوڑی دُور پرے آصف نے اس کے پیچھے سے سر نکالا اور چلّایا: "ابّا، میں پھر آگیا۔" اور ڈاکٹر صاحب کو ایسے لگا جیسے ان کی بیوی نے انھیں جیتا جاگتا طعنہ بھیجا ہو! اب کی بار وُہ آصف سے ذرا سرد مہری سے پیش آئے۔ اس کی شرارتوں کو گھور گھور کے دیکھا اور گاہے گاہے اسے ٹوکتے بھی رہے۔ شام کو قاعدہ لے کر اُسے خود پڑھاتے، تختی پر اصلاح دیتے اور رات کو لیٹ کر گنتی سُنتے۔ آصف جس پابندی کے خوف سے امّاں کے پاس نہ رہا تھا وُہ اب یہاں بھی پہنچ گئی۔ اب اُس نے تہیہ کر لیا کہ اس دفعہ رحیم بخش کے ساتھ ایسا جاؤں گا اور پھر نہیں آؤں گا اور جب مہینہ شروع ہوا تو اس نے بہانے بہانے رونا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس خلل کو برداشت نہ کر سکے اور اسے پھر اماں کے پاس بھیج دیا گیا۔ لیکن امّاں صرف جھڑکیوں اور گھرکیوں پر ہی اکتفا کرتیں کبھی کبھار ایک آدھ طمانچہ یا دھموکا بھی لگا دیتیں اور پھر آصف سے تو انھیں خاص چڑ تھی جو بیٹھے بٹھائے ابّا کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا تھا۔

چھتوں پر مٹی ڈالنے اور کمروں میں سفیدی کرنے کے لیے رحیم بخش کوئی ہفتہ بھر وہاں رہا۔ اس دوران میں آصف کو امّاں کے سوتیلے پن سے زیادہ اسلم کی یاد پر غصّہ آیا جو رہ رہ کر اس کے دل میں ڈبکیاں لگا کر اسے بے چین کیا کرتی۔ جاتے وقت اس نے رحیم بخش کا تہمد تھام کر کہا: "مجھے پھر ابّا کے پاس لے چلو۔" تو اُس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا: "اماں سے پُوچھ لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

آصف ڈرتا ڈرتا امّاں کے پاس گیا اور اس سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ وُہ ابھی اس کے بڑے بھائی کو پیٹ کر بیٹھی تھی، بھنّا کر بولی۔

"جاؤ جاؤ! خدا کے لیے سب اسی کے پاس چلے جاؤ۔ دفان ہو جاؤ، مر جاؤ۔"

آصف نے اس غصّہ سے فائدہ اٹھایا اور آ کر رحیم بخش کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اس دفعہ ڈاکٹر صاحب نے آصف کو تو کچھ نہ کہا لیکن رحیم بخش کو اچھی جھاڑ بتائی۔ وُہ یہاں ان کی اَنی جھڑکیوں کو سینہ سے لگائے پھرتا تھا ایک اور کو بھی اسی کھاتہ میں جمع کر گیا۔ اب آصف کی تعلیم میں پہلے سے زیادہ سختی برتی جانے لگی۔ اُسے بہت

زیادہ کام دیا جاتا۔ رات کو کھڑا کر کے گنتی اور نظمیں یاد کرائی جاتیں۔ دن میں دو دو تختیاں لکھوائی جانے لگیں اور صبح جلدی اٹھا لیا جاتا۔ اُسے اماں کی قدر و عافیت اب معلوم ہوئی لیکن اس تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی۔ مہینہ کے شروع میں رحیم بخش پھر گاؤں گیا مگر اُسے چھٹی مانگنے کی ہمت نہ ہوئی اور اگر وہ ہمت کر بھی لیتا تو اسے اجازت کبھی نہ ملتی۔ اسلم کے ساتھ کھیلنے میں اب وہ لطف نہیں رہا تھا۔ بہت تھوڑا وقت ملتا اور بہت کم باتیں ہو سکتیں۔ ان کے گھر جانا بھی ممنوع تھا۔ اس طرح سے بہت سے ایسے قصے جو اسلم کی امّی نے ابھی اُسے نہیں سُنائے تھے پیدائش سے پہلے ہی سِسک سِسک کر دم توڑ گئے۔ اس دن بھر کی مصروفیت سے تنگ آ کر آصف کا دل چاہا کہ چند دنوں کے لیے بیمار بن جائے اور مزے سے لیٹ کر ان سنہری دنوں کو یاد کرتا رہے جب اس نے آپا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن اُسے بیمار ہونے کا کوئی مناسب ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا۔ اس لیے وہ اسی طرح آئیں بائیں شائیں کرتا رہا اور ایسے ہی پھرتے پھرتے اُس کے سر میں زور کا درد اٹھا اور وہ بخار سے لیٹ گیا۔ سر درد کی شدت اور بخار کی حدت سے اُسے آرام نہ ملا۔ دو چار دن تک تو ڈاکٹر صاحب خود دوا دارو کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک صبح اُسے رحیم بخش کے ساتھ سول ہسپتال بھیج دیا۔ وہاں سے آئی ہوئی دوا کڑوی ضرور تھی مگر مفید نہ تھی۔ آصف علیحدگی میں رحیم بخش سے کہتا رہا کہ مجھے اماں کے پاس چھوڑ آؤ مگر اس نے کوئی پروا نہ کی۔ ایسے ہی ایک دن اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے ابا سے بھی کہہ دیا مگر وہ رکھائی سے ٹال گئے۔ اس کے بعد اُسے اماں اماں کی رٹ کے دورے پڑنے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ڈاکٹر صاحب کو سونا دوبھر ہو گیا اور یہ انھیں گوارا نہ تھا۔ سب چیزوں سے نیند پیاری تھی۔ فوراً تانگہ منگوا کر دوائی کی بوتل سمیت اس کی اماں کے پاس بھیج دیا اور خود برآمدے میں چارپائی کھینچ کر گھوک سو گئے۔

گاؤں پہنچتے ہی آصف کا بخار اتر گیا اور وہ چند دن صرف اسی لیے بستر نہ اُٹھا کہ اماں کی نظرِ کرم فوراً بدل جائے گی لیکن اسے وہ بستر فوراً خالی کر دینا پڑا کیونکہ اس کے بڑے بھائی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ ایک آدھ ہفتہ تک تو سب اسی خیال میں رہے کہ معمولی بخار ہے اُتر جائے گا۔ پر جب ٹمپریچر بڑھتا گیا اور اس کی

حالت غیر ہو گئی تو ڈاکٹر صاحب کو بلوا بھیجا۔ وُہ اسی دن شام کو وہاں پہنچ گئے بچّے کو دیکھا۔ قریبی ڈاکٹر کو بُلایا گیا اور اُس کے ٹیکے لگنے شروع ہو گئے۔ تھوڑے عرصے میں بخار اتر گیا اور بستر پر لیٹے لیٹے پاس سے گذرنے والے ہر آدمی کو ٹک ٹک دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے جانے کی تیاری شروع کر دی تو آصف پھر ان کے ہمراہ تیار ہو گیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نہیں مانے۔ وُہ رونے لگا تو جھڑک دیا گیا۔ اس نے امّاں سے کہا تو وُہ بھی جھنجھلا کر بولیں "کیا کرے گا وہاں جا کر؟ پہلے کون سی ایسی خاطر ہوئی جو اب پھر تیار ہو گیا ہے۔ ایک بار جو شرماشرمی لے گئے تو تُو اسی پر پھُول بیٹھا ذرا آئینے میں اپنا حُلیہ تو دیکھ، ہلدی کی گانٹھ بنا ہُوا ہے۔ دو دن بخار چڑھا اور اُٹھا کے میرے پاس بھیج دیا۔ کسی کی بکری، کون ڈالے گھاس! باپ کا دل اور ایسا کٹھور۔ پھر کوئی تجھ سے پوچھے۔ جب وُہ میری نہیں سنتا تو تیری کیسے مانے گا! ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی۔ اُسے اپنے کھُل کھیلنے سے فرصت ہو تو تیری خبرگیری کرے۔ وہاں کی چپڑی سے یہاں کی رُوکھی اچھی۔ میرے بچھڑوں سے وہاں کی سڑی بسائندھی باتیں اچھی نہیں؟ جہاں میں آفت کی ماری ٹھنڈا توتی پڑی ہوں تو بھی نچلا ہو کے بیٹھا رہ۔ محلوں کے خواب دیکھے گا تو جھونپڑے کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔"

وُہ تو شاید اتنی لمبی چوڑی تقریر نہ کرتیں لیکن ڈاکٹر صاحب جو ساتھ کے غسل خانے میں دانت صاف کر رہے تھے صرف انھیں سُنانے کی غرض سے آواز کو بھی اُونچا اور مضمون کو بھی لمبا کرنا پڑا۔ بیگ میں کپڑے ڈال کر ڈاکٹر صاحب نے آصف سے کہا۔ "فوراً تیار ہو جاؤ۔ میں تمھیں ساتھ لے جاؤں گا۔" ابّا کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جھٹ چھوٹی سی گٹھڑی باندھ کر بیگ کے پاس لا کر رکھ دی۔ اسٹیشن گاؤں سے یہی کوئی میل ڈیڑھ میل تھا۔ ڈاکٹر صاحب گھوڑے پر چڑھنے سے کتراتے تھے۔ اس لیے چکّر کاٹ کر ریل گاڑی کا سفر کرتے تھے۔ جاتی دفعہ اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹا، کل پھر نہ بھاگ آنا۔ وہاں رہے گا۔ تو پڑھ لکھ کر صاحب بنے گا۔ یہاں تو لے دے کے ماں کی ممتا ہے۔"

اسٹیشن کو جاتے ہوئے آصف نے ایک دو دفعہ ابّا کو بُلایا مگر وُہ بولے نہیں، یونہی چلتے رہے۔ گاؤں سے باہر نکل کر سرکنڈوں اور بیری کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے درمیان سے گزرتے انھوں نے ذرا رُک کر ایک سرکنڈا توڑ لیا اور آصف

کے کندھے پر پُورے ہاتھ کا وار دیا۔ وُہ بلبلا کر اُچھلا اور اس کی گٹھڑی اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر راہ میں گر گئی۔ اُس نے مُڑ کر رحم طلب نگاہوں سے باپ کو دیکھا مگر اس کے جواب میں دو نیلی نیلی آنکھیں اس کی پنڈلیوں پر نقش ہو گئیں۔ اس کے بعد گویا آسمان سے بجلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے مُنحنی جسم سے لپٹ لپٹ گئیں۔ سرکنڈا پڑتے ہی ایک خفیف سا دھکا لگتا۔ پھر اس حصّۂ جسم میں حرارت پیدا ہوتی اور آگ کی ایک لاٹ کیچڑ میں دبے ہوئے سانپ کی طرح اُوپر اُبھرتی اور سارا جسم اس کی حدّت سے تمتما اٹھتا۔ سانپ پھر کیچڑ میں دھنس جاتا مگر باہر ایک تیزابی کینچلی چھوڑ جاتا جو کروٹیں بدل بدل کر گویا دہکتی رہتی۔ پھر ٹوٹ کر گرتی اور ایک سانپ اور پھنکارنے لگتا۔ اس طرح اس کے بھورے رنگ کے جسم پر کلّر کے بہت سے کوڑیالے لہرانے لگے! کبھی وُہ تیز تیز قدم اُٹھاتا اور کبھی ہولے ہولے اونٹ کی طرح دوڑنے لگتا۔ مگر رفتار کی تیزی ضربوں کی شِدّت میں کوئی تخفیف نہ کر سکتی۔ اس کے مُنہ سے مسلسل چیخوں کے علاوہ "ابّا میری توبہ! ابّا جی میری توبہ!" لرز لرز کر نکل رہا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب ایک ہی رفتار سے پیٹے جاتے تھے "حرام زادے، چغل خور، لگائی بجھائی کرتا ہے۔ اس کمینی سے میری شکایتیں کرتا ہے۔ اب درست ہو جائے گا ذلیل انسان۔ کتّے کی اولاد۔ سؤر کا بچہ — ایسی دوں فطرت عورت میرے مُنہ آئے۔ ایک سیّد زادے کے مُنہ، جس نے آج تک کسی سے تُو نہیں کہلوایا۔ تُو نہیں کہلوایا، حرام زادے تُو نہیں کہلوایا" اور پھر ہر تُو کے ساتھ سرکنڈے کی "زدن" میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ادھر سے وہی صدا بلند ہوتی، وہی "ابّا جی میری توبہ۔ ابّا جی میری توبہ!" جو آہستہ آہستہ دلدوں کے کنوئیں میں محبوس سیاہ آنکھوں والی آدم زاد کی سسکیاں بنتی گئی۔

اسٹیشن سے تھوڑی دور ادھر ڈاکٹر صاحب نے سرکنڈا پرے پھینک دیا اور آصف کی گٹھڑی اُسے دے دی۔ سٹیشن پر پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے دو کیلے خریدے۔ ایک خود کھانے لگے اور دوسرا اُسے . . . . دیا مگر آصف نے کھایا نہیں اپنی گٹھڑی میں رکھ لیا۔ پھر وُہ سامنے والے ٹین کے چھوٹے سے کمرے میں پیشاب کرنے چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے اپنی رانوں اور پنڈلیوں پر مار کے نشان غور سے دیکھے انھیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ مُنہ کے آگے ہاتھ رکھ کر اس نے دو دفعہ زور سے "امّاں! امّاں!" کہا اور پھر اپنی قمیص سے آنسو پُونچھ کر باہر آ گیا۔

مسافر خانے کی آہنی چھت پر بہت سے کبوتر ایک دوسرے سے چونچیں لڑا رہے تھے۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پنجوں کی خراشیں ہی اس خاموش فضا میں ایک مسلسل آواز تھی۔ چھوٹے سے سٹیشن پر چند مسافر اُونگھ رہے تھے۔ ایک چھابڑی والا پھل سگریٹ، دال روٹی اور شربت بیچ رہا تھا۔ سارے مسافر خانے میں صرف ایک ہی پوسٹر تھا۔ "قطار باندھ کر ٹکٹ خریدیے"۔ باہر لکڑی کی ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی جھونپڑی میں پینے کا پانی رکھا تھا۔ بنچوں پر روغن کے علاوہ میل کا ایک دبیز غلاف چڑھا ہوا تھا اور ہوا میں پھلوں، سگریٹوں، پان کی پیک، پتھریلے کوئلے کے دھوئیں اور زنگ آلود لوہے کی بُو لہرا رہی تھی جو ایک جگہ جمع ہو کر اسٹیشن کا نام پاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آصف کے آنسوؤں سے دھوئے دھائے چہرے کو دیکھا اور اس کے لیے شربت کا ایک گلاس لائے مگر اس کی طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ صرف ان کی دہشت سے رُعب کھا کر اس نے ایک دو گھونٹ بھر لیے اور انھیں عاجزی سے تکنے لگا۔ باقی ماندہ شربت ڈاکٹر صاحب نے خود پی لیا اور پھر اس کے ذرا اور قریب ہو کر بیٹھ گئے۔

اگلے اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب نے اُسے ایک سنگترہ لے دیا اور خود ایک ہم سفر کا اخبار دیکھنے لگے۔ آصف کھڑکی کے ساتھ لگا ہوا باہر بھاگتے ہوئے درختوں اور کھمبوں کی اُوپر نیچے ہونے والی تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھار اس کے ڈھیلے ڈھیلے ہونٹ ایکا ایکی تالی سی بجاتے۔ اُس کی سانس ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ناک میں داخل ہوتی اور اس کے جسم کو ایک ساتھ تین چار جھٹکے لگتے جیسے کیچڑ میں دھنسی ہوئی لاری نے باہر نکلنے کو زور لگایا ہو تو اُسے ٹھنڈک سی محسوس ہوتی اور ایک سسکی کھڑکی کے راستے گاڑی سے باہر نکل جاتی۔

گھر پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ اُسی وقت گٹھڑی میں سے کتاب نکال کر بوری بچھا کر بیٹھ گیا۔ شام کو وہ کل کے سپاہی کی طرح ان کی چارپائی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور سینہ پر ہاتھ باندھ کر اُگلنے لگا۔

مسافر غریب ایک رستے میں تھا
وہ چوروں کے ہاتھوں میں جا کر پھنسا

اور جب یہ نظم ختم ہو گئی تو دُونی کا پہاڑہ سنانے لگا اور جب وہ تین کا پہاڑہ شروع کرنے والا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "بس ٹھیک ہے۔ اب سو رہو۔"

"اچھا جی" کہہ کر وُہ ساتھ والی چارپائی پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔ حقہ کی نَے پرے دھکیل کر ڈاکٹر صاحب وضو کرنے کے لیے اُٹھے تو انھوں نے آصف کی کھُلی ہوئی گٹھڑی کو برآمدے میں دیکھا۔ وُہ خراماں خراماں ادھر گئے۔ اُسے کھولا اور کپڑوں کو اُلٹنے پلٹنے لگے۔ سب سے آخری کپڑے کے نیچے ایک کیلا اور سنگترہ پڑا تھا۔

اب ہسپتال میں نہ کوئی شرارت ہوتی تھی۔ نہ شور مچتا تھا۔ اسلم کی ماں نے کئی مرتبہ اسلم سے کہا کہ اپنے دوست کو بھی کہانیاں سُنانے کے لیے لایا کر مگر دوست آتا تو اسلم لاتا۔ کئی بار اسلم نے رنگے گھر بلانے کی تجویز پیش کی، پچھلے دنوں کی مزیدار کھیلیں یاد کرائیں، ہسپتال سے چیزیں چرانے کا لالچ دیا مگر وہ نہیں مانا تنگ آکر اسلم نے اپنے پچھواڑے گورکن کے لڑکے مہندی سے راہ و رسم پیدا کرلی اور آصف سے کٹی کر دی۔

آصف کو اس طرح خاموش دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کو بہت دُکھ ہوا۔ اُس کی رفتار اور گفتار سے گھر پر مُردنی سی چھا گئی تھی۔ چلتا تو ایسے لگتا جیسے غبار آلود دوپہر کو صحن میں اخبار کا کوئی کاغذ لڑھک رہا ہو۔ بولتا تو کتاب کی عبارت اور پہاڑوں کے ہندسوں کے سوا کچھ نہ کہتا۔ لے دے کے ایک "اچھا جی" تھا جو ذکرِ حق کی طرح ہر وقت اس کی زبان پر جاری رہتا۔ ڈاکٹر صاحب ایک دن بازار سے اس کے لیے ایک چھوٹا سا پیانو خرید کر لائے جو بڑی پیاری آوازیں نکالتا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ ساری سُروں کو بجا کر دیکھا اور پھر اُسے اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ کبھی کبھار رحیم بخش اُس پیانو کو الماری سے نکال کر اپنے چھوٹے بیٹے کو دے دیتا جو باورچی خانے میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر اسے بجایا کرتا۔

اکثر دوپہر کو اُس کے ابا چارپائی پر لیٹ کر پُوچھتے "کیوں بھئی ہمیں نہیں سناؤ گے اپنا پیانو؟" تو وُہ اچھا جی کہہ کر الماری کھولتا، پیانو نکالتا اور ایک مرتبہ ساری سُریں بجا کر پُوچھتا "بس جی؟" اور پھر ان کے حکم کے انتظار میں دیر تک وہاں کھڑا رہتا۔

کبھی ڈاکٹر صاحب شام کو اندر سے آواز دے کر پُوچھتے۔

"آصف میاں، کیا کر رہے ہو؟"

"جی کھڑا ہوں۔"

"کیوں؟"

"جی رحیم بخش تنور پر روٹی لگوانے گیا ہے جی۔"

"لیکن تم کیوں کھڑے ہو، بیٹا؟"

"جی مجھے رحیم بخش کھڑا کر گیا ہے جی باورچی خانہ کے پاس۔"

"اسے کہو دروازہ بھیڑ کر جایا کرے۔"

"اچھا جی۔"

جب وُہ چوتھی مرتبہ تختی لکھ رہا ہوتو ڈاکٹر صاحب اندر آ کر کہتے "اب بس کر دو بیٹا۔" تو وُہ اچھا جی کہہ کر لکھنا وہیں چھوڑ دیتا۔

سرِشام اگر کبھی وُہ جلد چادر تان کر بستر پر لیٹ جاتا تو ڈاکٹر صاحب پوچھتے "ابھی سے کیوں لیٹ گئے آصف میاں؟"

"جی ایسے ہی۔" وُہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔

"لیٹے رہو، بیٹا۔"

"اچھا جی۔"

ڈاکٹر صاحب نے پچھلے دن لوٹا لینے کی لاکھ کوشش کی مگر وُہ پلٹ کر نہیں آئے۔ انھوں نے اسلم کو لالچ دیا۔ رحیم بخش سے مشورے کیے مگر کوئی بھی فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ آصف کی ہسپتال کی پہلے دن کی زندگی لوٹ کر نہ آسکی۔

اِس دوران میں انھوں نے آصف کو صرف ایک بار کھُل کر باتیں کرتے سنا جب اُن کے یہاں ایک مشکی گھوڑی نے نیلی آنکھوں والا ابلق بچھیرا دیا تھا۔ یہ ایک انگریز کی گھوڑی تھی۔ جس نے اسے بچہ دینے سے چند روز پہلے ہسپتال میں داخل کروا دیا تھا۔ دوپہر کو لالُو جمعدار نے آصف کو بُلا کر کہا "آؤ میاں جی تمھیں بچھیرا دکھائیں۔"

بچھیرا پیال پر پڑا تھا۔ اُس کی ماں مُنہ میں پڑی ہوئی کڑبی چبا رہی تھی اور دُم ہلا ہلا کر ایک ضدی مکھی کو اُڑا رہی تھی۔ بچھیرے کی تھوتھنی بہت تیکھی تھی۔ کنوتیاں بالکل سیدھی اور ٹانگیں اپنی ماں سے دُگنی لمبی تھیں۔ پتلی سی گردن پر کتاب جتنا سیاہ داغ تھا اور ایال روشنائی کی طرح سیاہ تھی۔ پیال کے بہت سے تنکے اُس کی ایال میں پھنسے ہُوئے تھے۔

آصف نے کہا "لالو، میں اندر جا کر دیکھوں گا۔"

لالُو نے کہا "ذرا ٹھہرو، میاں، میں گھوڑی کے دہانہ ڈال کر اُسے دور اسہ باندھ دُوں۔"

اندر جا کر لالُو نے کھُونٹی اُتار کر دہانہ اُس کے مُنہ میں ڈال دیا اور دو ایمیں بائیں پیادوں میں لٹکتے ہوئے آہنی حلقوں میں اُس نے گھوڑی کو دور اسہ باندھ دیا۔ آصف کو اندر آتے دیکھ کر گھوڑی پھنکاری اور اگلے پاؤں سے فرش کھکھوڑنے لگی لیکن آصف ڈرا نہیں۔ وُہ بچھیرے کے پاس بیٹھ گیا اور اس کی ایال سے تنکے چُننے لگا۔ جب بچھیرا سانس لیتا تو اُس کی ہڈیاں صاف دکھائی دیتیں۔ جسم کے بال ریشم ایسے ملائم اور اُون کی طرح چمک دار تھے۔ کندھوں کی مچھلیاں خود بخود پھڑک رہی تھیں۔ آنکھیں آسمان ایسی نیلی تھیں اور نرم نرم سُم چقندر کے بڑے بڑے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی دُم سفید تھی اور پٹھا سیاہ!

آصف نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "لالو، یہ بچھیرا میں لوں گا۔ اباجی سے کہہ کر چھوٹی سی زین بنوا لوں گا اور پھر میں اس پر سوار ہو کر اماں جی کے پاس جایا کروں گا ــــــ لیکن میں رہوں گا تھوڑی۔ شام سے پہلے یہاں واپس آجایا کروں گا۔"

لالو ہنسنے لگا اور بچھیرے کی گردن سہلاتے ہوئے بولا "میاں یہ بچھیرا اپنا تھوڑا ہے۔ صاحب کا ہے۔ ہاں ڈاکٹر جی خرید لیں تو پھر اپنا ہو سکتا ہے۔"

"میں اباجی سے کہوں گا۔ اباجی مجھے خرید نہ دیں گے؟"

"خرید دیں گے، میاں، پر ــــــ"

"پر کیا، لالو؟"

"پر یہی کہ ــــــ وُہ خرید دیں گے۔ خرید کر کیوں نہ دیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب لائی سول کی پچکاری لے کر ادھر آ رہے تھے کہ آصف کو اس طرح بولتے دیکھ کر ٹھٹک گئے اور جب آصف باہر نکلنے لگا تو وُہ ساتھ کے کمرے میں جہاں ایک ٹانگ ٹوٹی بھینس چھت سے لٹک رہی تھی چھپ گئے۔

شام کو انھوں نے صاحب کی بہت خوشامدیں کیں کہ وُہ بچھیرا بیچ دے مگر وُہ نہ مانا لیکن اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ جب تک بابا لوگ کا دل اس سے بالکل بھر نہ جائے گا وُہ بچھیرا لوگ کو گھر نہیں لے جائے گا۔

دوپہر کو جب ڈاکٹر صاحب برآمدے میں لیٹ کر سو جاتے تو آصف چپکے

سے اُٹھتا اور بچھیرے کے کمرے میں چلا جاتا۔ اپنے بچے کے ساتھ اس محبت سے پیش آتے دیکھ کر اب گھوڑی بھی آصف سے پیار کرنے لگی تھی۔

وُہ اسی جگہ گھنٹہ بھر بیٹھا لالو یا اس کے لڑکے سے گھوڑوں کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ بعض اوقات ڈاکٹر صاحب بیدار ہو کر اُسے کوارٹر میں نہ پاتے تو دبے پاؤں اُس کی باتیں سننے مویشی خانے تک چلے آتے اور دیر تک کھڑے سنتے رہتے لیکن ایک شام یہ جادُو بھی ٹوٹ گیا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے یہ چاہا کہ وُہ اتنی ساری باتیں کبھی ان کے ساتھ بھی کرے ، جس وقت وُہ باورچی خانہ سے چنے کی دال مٹھیاں بھر کر بچھیرے کو کھلانے چلا تو ڈاکٹر صاحب اخبار کی اوٹ میں سے بولے "بیٹا، چھوٹے بچے دانہ نہیں کھاتے۔"

"اچھا جی۔" کہہ کر اُس نے دال کنستر میں ڈال دی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر کہا "وہ جب بڑا ہو جائے گا تو دانہ کھائے گا۔ ابھی تو اپنی ماں کا دودھ ہی پیے گا۔"

"اچھا جی۔"

"تمھیں اچھا لگتا ہے یہ بچھیرا؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں جی" وُہ ڈر گیا۔

"مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اچھا جی۔"

پھر وُہ دبے پاؤں اندر کمرے میں کھسک گیا اور جزدان کھول کر نظم یاد کرنے لگا اور ڈاکٹر صاحب سوچنے لگے "اگر میں اسے نہ بُلاتا تو کتنا اچھا ہوتا اور اگر میں اُسے نہ دیکھتا تو اس سے بھی اچھا ہوتا۔" لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ آصف نے بچھیرے کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ گھوڑی ہلکی سی آہٹ پا کر سر پھیر کر دروازے میں دیکھنے لگتی اور اس کا بچہ پیال پر بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھی کو یاد کر کے کنوتیاں گھماتا رہا لیکن آصف اسی چھوٹی سی بوری پر بیٹھ کر یہی الاپتا رہا ؎

الفوں نے لیے اس کے کپڑے اُتار
کیا گھائل اور اَدھ مؤا مار مار

اور جب وُہ اِتنا کہتا تو لمبی لَے کے ساتھ اُن عار بن جاتا۔ آج بھی جب بوڑھا اپنے بھتیجے کے بنگلہ سے صبح صبح آصف کی زندگی کے بیمہ کی رقم لینے نکلا تھا تو مالی

کی بچّی اپنے باغیچے میں پھول چُنتے ہوئے اُونچے اُونچے گا رہی تھی:

مسافر غریب ایک رستے میں تھا

اور جب وُہ اشعار الاپتی تو اسی طرح اُٹ عار بن جاتا۔ بوڑھا مالٹے کے پودوں کے پیچھے چھُپ کر کھڑا ہو گیا اور جب تک وُہ وہاں سے چلی نہ گئی وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ اُٹ عار! اُٹ عار! اُٹ عار!

خزانچی نے کہا "ٹوکن نمبر چوبیس۔ نمبر چوبیس —— اگر نمبر چوبیس یہاں ہو تو پے منٹ لے لے جائی"

پھر وُہ دوسرا چیک اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

بوڑھے نے واسکٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ چوبیس نمبر ٹوکن! اس نے اسے ایک نظر دیکھا، پھر مٹھی میں دبا لیا۔ پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھی اور ٹوکن کو مٹھی میں بھینچے ہوئے بنک سے باہر نکل گیا۔ احاطہ میں آ کر اُس نے ہاتھ کو زور سے گھمایا اور مٹھی کھول دی۔ ٹوکن ہوا میں بلند ہُوا اور پھر بنک کی چھت پر جا گرا۔ بنک کے باہر تار گھر کے پاس اسٹیشن جانے والے تانگے کھڑے تھے۔ دو کوچوان بھاگ کر اس کی طرف بڑھے اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ بوڑھے نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی اور جب ایک کوچوان اسے جیت کر لے گیا تو وُہ اس کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔

سامنے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی زور زور سے سیٹیاں بجا رہی تھی اور جب اس نے ایک ڈبے کا دروازہ کھول کر قدم اندر رکھا تو گاڑی چل دی۔

دو گھنٹہ بعد اس کا دل اس سفر سے اُکتا گیا اور وُہ ایک دیہاتی اسٹیشن پر اُتر کھڑا ہُوا اور لائن کے ساتھ خاردار تاروں سے گزر کر چھکڑے کی لیک پر چلنے لگا۔ صبح سے بادل چھائے ہوئے تھے اور شاید کہیں دُور بارش بھی ہو رہی تھی۔ اُس نے تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کر دیے۔ ایک یکہ اس کے پاس سے گذرا۔ کوچوان نے پُوچھا۔

"بابا، بریالہ جا رہے ہو؟"

"ہاں"

"تو آؤ پھر۔ بارش آ رہی ہے۔ دو روپے دے دینا۔ راستہ میں بھیگ کر

کمبل ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میں ایسے ہی پہنچ جاؤں گا۔" بوڑھے نے ذرا اور تیز ہو کر کہا۔

"لا، بابا، ڈیڑھ روپیہ دے گا۔"

"نہیں، بھائی، نہیں۔ میں تو پیدل ہی آؤں گا۔"

یکے والے نے راسیں گھما کر زور سے گھوڑے کے پیٹ پر ماریں اور اونچے اونچے گانے لگا۔ "دے گیا دوانی کھوٹی۔ ہو بابا دے گیا دوانی کھوٹی۔ ہو بابا دے گیا۔ ہو بابا دے گیا!"

اوپر تیرنے والے سیاہ بادل نے زور سے "بابا! بابا! بابا!" کہہ کر اس کا جواب دیا اور چٹاخ پٹاخ کتنی ساری موٹی موٹی بوندیں نیچے آگریں۔ بوڑھے نے اپنے خاکی اوور کوٹ کے کالر اوپر اٹھا لیے اور رفتار ذرا سست کر دی۔ بادل بلبلا کر دھاڑا اور بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تراٹے دھار بوچھاڑیں آئیں، پھر جھما جھم موسلا دھار برسنے لگا۔ بوڑھے کی پگڑی بھیگ کر ڈول کی طرح بھر گئی۔ سفید داڑھی ڈوبی ہوئی بلی کی طرح لٹکنے لگی اور کوٹ غوطہ خوروں کا آہنی لباس بن گیا۔ چپلی بار بار کیچڑ میں پیچھے رہ جاتی اور اس کا ننگا پاؤں آگے جا پڑتا۔ نہر پر پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسٹیشن غائب ہو چکا تھا اور اس طرف بالکل اندھیرا چھا گیا تھا۔ نہر کے کنارے چھوٹے سے کوارٹر میں بیلدار کی بیوی ہنڈیا بھون رہی تھی۔ چولھے کی روشنی کھڑکی سے باہر نکل کر تھوڑی دور تک اندھیرے کا مقابلہ کرتی اور اس کے بعد معدوم ہو جاتی۔ کوارٹر کی دیوار کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنی داڑھی اور آستینوں کو نچوڑا اور پھر چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا بوڑھے جسم میں تیر بن کر اتر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ پگڈنڈی سیدھی تھی اور گاؤں پتہ نہیں کتنی دور۔ کئی بار اس کی پسلیوں میں بلا کا درد اٹھا، کئی بار اس کے قدم لڑکھڑائے، اس کا سانس رک رک گیا اور اس کی نگاہ نے کام کرنا بند کر دیا مگر وہ رکا نہیں۔ ایسے ہی چلتا رہا۔ دو گھنٹے کی مسلسل مسافت کے بعد اسے ایک چبوترہ سا نظر آیا۔ بجلی چمکی اور اس نے غور سے دیکھا گاؤں کا پنگھٹ تھا۔ وہ اس کے پہلو سے ہو کر ایک گلی میں گھس گیا۔ اس گلی کے خاتمہ پر ایک کھلا میدان تھا۔ تین طرف کچے پکے گھر تھے اور ایک طرف لمبا چوڑا

جو بڑ- کوڑے کے ڈھیر پر سے ہوتے ہوئے وُہ ایک بڑے سے احاطہ میں داخل ہو گیا- نکڑ پر ایک ٹوٹا ہوُا چھکڑا اوندھا پڑا تھا- اس کے سامنے ایک چھپر تلے تنور جل رہا تھا اور چند عورتیں سردی سے ٹھٹھری ہوئی باسی باسی باتیں کر رہی تھیں- سامنے ایک نیچی مستطیل عمارت میں جس کے چاروں طرف کھپریل کا برآمدہ تھا الاؤ جل رہا تھا- ایک آدمی کے ارد گرد بہت سے لڑکے بیٹھے جھُوم جھُوم کر سبق یاد کر رہے تھے- برآمدے کے ایک ستون سے ڈاک ڈالنے کا ڈھول لٹکا ہوُا تھا- بوُڑھا ہولے ہولے قدموں سے ادھر بڑھا اور ایک ستون سے لگ کر خفیف آواز میں بولا "ماسٹر جی! میں پڑھا لکھا مہاجر ہوں- مجھے اپنا ماتحت رکھ لیجیے —— میں بچّوں کو بالکل مارتا نہیں"!

اور الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے سارے بچّے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اسے حیرت سے دیکھنے لگے-

---

امّی

وُہ بڑے صاحب کے لیے عید کارڈ خرید رہا تھا کہ اتفاقاً اُس کی ملاقات امّی سے ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے امّی سے آنکھ بچا کر کھسک جانا چاہا لیکن اس کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے اور وُہ اپنی پتلون کی جیب میں اکنّی کو مسلتا رہ گیا۔ اچانک امّی نے اُسے دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "ارے سُودی، تم کہاں؟"

اس نے فوراً اپنی جیب سے ہاتھ نکال لیا اور ایک عید کارڈ اُٹھا کر بولا "یہیں، امّی، میں تو یہیں ہوں"۔

"کب سے؟" امّی نے حیرت سے پُوچھا۔

"تقسیم کے بعد سے امّی میں بھی یہاں ہوں اور ماں اور دوسرے لوگ بھی"۔

"لیکن مجھے تمھارا پتہ کیوں نہ چلا۔ میں نے تمھیں کہیں بھی نہ دیکھا"۔

اس کے جواب میں وُہ ذرا مسکرایا اور پھر عید کارڈ کا کنارہ اپنے کھُلے ہوئے ہونٹوں پر مارنے لگا۔ دکان کے لڑکے نے بڑے ادب سے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے میز پر پھیلے ہوئے دوسرے کارڈوں میں ڈال کر اندر چلا گیا۔

امّی نے اپنا پرس کھولتے ہوئے پوچھا "اب تو تُو اپنی ماں سے نہیں جھگڑتا؟"

مسعود شرمندہ ہو گیا۔ اُس نے عید کارڈوں پر نگاہیں جما کر کہا: "نہیں تو۔ میں پہلے بھی اس سے کب جھگڑتا تھا"۔

امّی نے کہا "یُوں تو مت کہہ۔ پہلے تو تُو بات بات پر اس کی جان کھاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فساد برپا کر دیتا تھا"۔

اُس نے صفائی کے طور پر امّی کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر جواب دیا۔ "جب تو میں چھوٹا سا تھا، امّی۔ اب تو وُہ بات نہیں رہی نا"۔

لیکن اس جواب سے امّی کی تسلّی نہ ہوئی اور اُس نے بات بدلتے ہوئے کہا "تیرا

دوست تو بُو، کے چلا گیا انجینیئرنگ کی تعلیم پانے - یہ عید کارڈ اسی کے لیے خرید رہی تھی۔"

"کہاں؟ انگلینڈ چلا گیا؟" اس نے حیران ہو کر کہا "جبھی تو وُہ مجھ سے ملا نہیں۔ میں بھی سوچ رہا تھا۔ اُسے ہوا کیا۔ یہاں ہونا اور مجھ سے نہ ملنا۔ کیسی حیرانی کی بات ہے۔"

امّی نے آہستہ سے دُہرایا "ہاں وُہ انگلینڈ چلا گیا۔ ابھی دو سال اور وہیں رہے گا۔ یہ عید کارڈ اسی کے لیے خریدا ہے۔" اور اس نے کارڈ آگے بڑھا دیا۔ اس پر غریب الوطنی، دُوری اور ہجر کے دو تین اشعار لکھے تھے۔

مسعود نے اُسے ہاتھ میں لیے بغیر کہا "لیکن یہ عید تک اُسے کیسے مل سکے گا۔ عید تو بہت قریب ہے۔"

امّی نے وثوق سے کہا "ملے گا کیسے نہیں۔ میں بائی ایئر میل جو بھیج رہی ہوں۔"

"لیکن بائی ایئر میل بھی یہ وقت پر نہ پہنچ سکے گا" مسعود نے جواب دیا۔

امّی نے کہا "تو کیا ہے۔ اسے مل تو جائے گا۔ ایک آدھ دن لیٹ سہی۔"

اور مسعود کے کچھ کہنے سے پیشتر امّی نے کہا "کبھی ہمارے گھر تو آنا۔ تمھاری دیدی نے بائیم۔ اے کا امتحان دے دیا ہے۔ ضرور آنا۔ عید پر چلے آنا۔ ہم اکٹھے عید منائیں گے۔"

جب امّی مسعود کو اپنا پتہ لکھا کر چلنے لگی تو اس نے اپنا فون نمبر بتاتے ہوئے کہا "آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر لینا۔ میں اکثر دَورے پر رہتی ہوں لیکن عید کے روز میں ضرور گھر پر ہوں گی۔"

مسعود نے پتے کے ساتھ ایک کونے پر فون نمبر بھی لکھ لیا۔ امّی نے ایک مرتبہ پھر اُس کے شانے پر ہاتھ پھیرا اور اپنی ساڑھی کا پلّو درست کرتے ہوئے دکان سے نیچے اُتر گئی۔ مسعود نے پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اکنّی کو چٹکی میں پکڑ لیا اور بڑے صاحب کے لیے عید کارڈ انتخاب کرنے لگا۔

مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے کسی دُور کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔ اوّل اوّل تو اس کی دوسری شادی کا مقصد مسعود کی تعلیم و تربیت تھی۔ لیکن اپنے دوسرے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اُسے مسعود کو تقریباً بھلا ہی دینا پڑا۔ مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں جب مسعود کو اپنے

چچا سے فیس مانگنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وُہ کئی دن یُونہی ٹال مٹول میں گذار دیتا۔ پیسوں کے معاملے میں اُس کی ماں بالکل معذور تھی۔ گھر کے معمولی اخراجات تک کے لیے اُسے اپنے خاوند کا مُنہ تکتے رہنا پڑتا اور وُہ اپنی کم مائیگی اور تہی دستی کا غصّہ مسعود پر اُتارا کرتی۔ ہر صبح اُسے چولھے کے پاس بیٹھ کر چائے کی پیالی اور رات کی ایک باسی روٹی کے ساتھ یہ فقرہ ضرور سُننا پڑتا: "لے مرلے تیری خاطر مجھے کیا کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔" یہ جملہ گو مسعود کو نہایت ہی ناگوار گزرتا۔ لیکن ہر روز ناشتے کے لیے یہ بل کچھ ایسا بڑا بھی نہ تھا اور فیس ادا کرنے کے دن تو اس بل میں اچھا خاصا اضافہ ہو جاتا۔ اس کا چچا حقّہ پیتے ہوئے کہتا۔

"پڑھنا وڑھنا تو ہے نہیں۔ یُونہی آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔ میں نے تیری ماں سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ تجھے ڈاکٹر بیگ کے یہاں بٹھا دیں تاکہ کچھ کمپاؤنڈری کا کام ہی سیکھ لے۔ آگے چل کر تیرے کام آئے گا۔ لیکن پتہ نہیں وُہ کن خیالوں میں ہے۔"

مسعود دونوں بانہیں سینے کے ساتھ لگا کر آہستہ سے جواب دیتا: "کام تو اچھا ہے جی۔ لیکن پہلے میں دسویں پاس کر لوں پھر ۔ ۔ ۔ ۔"

اور چچا صاحب طنز سے مسکرا کر ایک باچھ ٹیڑھی کر کے بیچ میں بول اُٹھتے۔

"بس بس جیسی کوکو ویسے بچے! یہی بات تیری ماں کہا کرتی ہے۔ اسے جب معلوم ہو اگر خود کما کر تیری روز روز کی فیسوں کی چٹّی بھرے۔ کتنی فیس ہے تیری؟"

مسعود ذرا سہم کر جواب دیتا: "چار روپے تیرہ آنے جی!"

"اچھا اس مرتبہ تیرہ آنے کا اضافہ ہو گیا۔"

"کھیلوں کا چندہ ہے جی۔ ماسٹر جی نے کہا تھا کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تو کہہ دے اپنے ماسٹر واسٹر سے کہ میں کھیل نہیں کھیلتا اور تجھے شرم نہیں آتی کھیلیں کھیلتے ہوئے۔ اُونٹ کی دُم چُومنے جتنا ہو گیا ہے اور کھیلیں کھیلتا ہے۔"

مسعود آہستہ سے کھنکار کر جواب دیتا: "میں تو کچھ نہیں کھیلتا جی، پر ماسٹر جی کہتے ہیں کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دینا پڑے گا۔"

"یہ اچھا رواج ہے۔" اُس کا چچا سر ہلا کر کہتا: "کھیلو چاہے نہ کھیلو، لیکن چندہ ضرور دو۔ سکول ہے کہ کمشنر کا دفتر۔ چندہ نہ ہُوا وار فنڈ ہُوا۔"

چونکہ عام طور پر ایسی بات کا جواب مسعود کے پاس نہ ہوتا۔ اس لیے وُہ خاموش

ہی رہتا۔ اس کے بعد اس کا چچا پاس ہی کھونٹی پر لٹکتی ہوئی اچکن سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر کہتا " لے پکڑ۔ اپنی ماں کو بتا دینا اور سکول سے لوٹتے ہوئے باقی کے تین آنے مجھے دفتر دے جانا "

خوف، نفرت اور تشکّر کے مِلے جُلے جذبات سے مسعود کی آنکھیں پھٹتیں، بند ہوتیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتیں اور وُہ نوٹ اپنی مٹھی میں دبا کر ماں کو بتانے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتا اور اس کا چچا اپنے کمرے میں حقہ بجاتے ہُوئے ہانک لگاتا " فیس دے دی ہے جی تمھارے شہزادے کو۔ ڈپٹی صاحب کو! "

یہ سنتے ہی مسعود ایک دم رُک جاتا اور جی ہی جی میں اپنی ماں کو ایک گندی سی گالی دے کر وُہ اُلٹے پاؤں اپنی کوٹھڑی میں جا کر بستہ باندھنے لگتا۔ چچا جیسے بیہودہ آدمی سے شادی کر کے اس کی ماں اس کی نگاہوں میں بالکل گِر چکی تھی اور وُہ چچا کی طعن آمیز باتوں کا بدلہ ہمیشہ اپنی ماں کو گالی دے کر چکایا کرتا۔

تفریح کی گھنٹی میں درختوں کے سائے تلے اپنے کھیلتے ہوئے ہم جولیوں کی دعوت سے انکار کر کے اسے سیدھا گھر بھاگنا پڑتا۔ خاصہ دان تیار ہوتا جسے اُٹھا کر وُہ جلدی جلدی اپنے چچا کے دفتر پہنچتا اور اسے ان کی کُرسی کے پاس رکھ کر بغیر کچھ کہے سکول بھاگ آتا۔ عرصہ سے اُس کی تفریحی گھنٹیاں یُونہی ضائع ہو رہی تھیں۔ صرف اتوار کے دن اُسے اپنے چچا کے دفتر نہ جانا پڑتا۔ لیکن اتوار کو کوئی تفریح کی گھنٹی نہیں ہوتی۔

آٹھویں جماعت کے سالانہ امتحان سے پہلے اس کے یہاں ایک چھوٹا بھائی پیدا ہُوا۔ جس کا نام اس کی ماں کے اصرار کے باوجود مقصود کے بجائے نصراللہ رکھا گیا۔ اس بھائی کی پیدائش نے مسعود سے اس کی ماں کو قطعی طور پر چھین لیا اور اس کی حیثیت گھر میں کام کرنے والے نوکر کی سی ہو کر رہ گئی جو اپنا اصلی کام ختم کرنے کے بعد پڑوس کے دروازے کی اونچی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بچّے کھلایا کرتا ہے۔ نصراللہ کی آمد کے دن سے مسعود کا چچا دن میں بار بار ڈاکٹر بیگ کا وظیفہ کرنے لگا اور مسعود کی ماں سے تقاضا کرتا رہا کہ چونکہ اب نصراللہ ہو گیا ہے اس کے اخراجات بھی ہوں گے اس لیے مسعود کو سکول سے اُٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے یہاں بٹھا دینا چاہیے لیکن اس کی ماں نہ مانی اور سلسلہ یُونہی

چلتا رہا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مسعود کے سکول میں موسم کے طلسماتی کارڈ بیچنے ایک آدمی آیا اور اُس کی وجہ سے مسعود کی ملاقات امّی سے ہُوئی۔ گلریز اپنی بیوہ امّی کا ایک ہی لڑکا تھا اور مسعود کا ہم جماعت تھا۔ جماعت بھر میں مسعود کی دوستی صرف گل ریز سے تھی۔ دونوں کو ننھی ننھی ٹوکریاں بنانے کا خبط تھا۔ پڑھائی کے دوران میں اگر کبھی اُنھیں فرصت کے چند لمحات میسّر آجاتے تو وُہ سائنس روم کے دروازوں سے چمٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیلوں سے ادھ سُوکھی لمبی لمبی رگیں توڑتے اور کھیل کے میدان میں ہری ہری گھاس پر ٹوکریاں بنانے لگتے۔ جس میں گلاب کا ایک پھُول یا چنبیلی کی چند کلیاں مشکل سے سما سکتیں۔ مسعود دستی والی ٹوکری بھی بنا لیتا تھا۔ لیکن گلریز سے ہزار کوششوں کے باوجود بھی ایسی ٹوکری نہ بن سکتی تھی اور وہ مسعود کی بنائی ہوئی ٹوکری لے لیا کرتا۔

ہاں تو جس دن ان کے سکول میں موسم کے طلسماتی کارڈ بیچنے والا آدمی آیا مسعود کی ملاقات امّی سے ہوئی۔ سفید کارڈوں کے بیچوں بیچ گلابی رنگ کا ایک بڑا سا سرخ دائرہ تھا جس پر ایک خاص مصالحہ لگا ہوا تھا! کارڈ بیچنے والے نے بتایا کہ جیسے جیسے موسم تبدیل ہوتا رہے گا اس دائرے کے رنگ بھی بدلتے رہیں گے۔ جُوں جُوں گرمی بڑھتی جائے گی گلابی دائرہ سرخ ہوتا جائے گا اور جب سردی کا زور ہوگا تو یہ گلابی چکّر بسنتی رنگ کا ہو جائے گا اور جس دن مطلع اَبر آلود ہوگا اور بارش برسنے کا امکان ہوگا تو یہ چکّر خود بخود دھانی رنگ کا ہو جائے گا۔ کارڈ کی قیمت دو آنے تھی۔ کلاس میں تقریباً سب نے وہ کارڈ خریدے اور جن کے پاس دو آنے نہ تھے انھوں نے بات اگلے دن پر اُٹھا دی۔

گھر سے خاصہ دان اُٹھاتے ہوئے مسعود نے ہولے سے کہا "اماں، مجھے دو آنے تو دو ہیں۔ . . . ."

مگر اُس نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا "میرے پاس کہاں ہیں دو آنے۔ کبھی مجھے پیسے چھُوتے ہوئے دیکھا بھی ہے۔ کون لا لا کے میری جھولیاں بھرتا ہے جو تجھے دو تی دُوں"

مسعود نے مایوس ہو کر خاصہ دان اُٹھا لیا اور چُپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا ــــ دفتر پہنچ کر اس نے خاصہ دان کرسی کے پاس رکھ دیا اور خلافِ معمول وہاں کھڑا ہو گیا۔ اس کے چچا نے فائل میں کاغذ پڑھتے ہوئے عینک کے اُوپر سے دیکھا اور ترش رُو ہو کر پوچھا "کیوں ؟ کھڑا کیوں ہے ؟"

"کچھ نہیں جی" مسعود کا گلا خشک ہو گیا۔

"کچھ تو ہے"

"نہیں جی کچھ بھی نہیں" اُس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

"تو پھر تو جیں کھڑی کیوں ہیں ؟"

"جی ایک دونی چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ اماں ۔ ۔ ۔ بیں ۔ ۔ ۔ سکول میں جی ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ہوں ہاں" اس کے چچا نے غرّا کر کہا "تجھے دونی دُوں ! تجھے ناداں دُوں ! میرے بورے جو ڈھوتا رہا ہے۔ میرے ساتھ جو کھیلتا رہا ہے"

مسعود شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا "میں میں ۔ ۔ ۔ ۔ اماں نے ۔ ۔ ۔ ۔ اماں نے ۔ ۔ ۔ ۔ جی سکول ۔ ۔ ۔ سکول میں ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہوں" اُس کے چچا نے کھرج میں کہا "تجھے پیسے دُوں ! تجھے دونیاں دُوں ۔ کیوں ؟ مجھے بین سُنا تا رہا ہے ۔ مجھے نبض دکھاتا رہا ہے ۔ تجھے پیسے دُوں ۔ ہوں تجھے دونی دوں ۔ ۔ ۔ ۔ تجھے ۔ ۔ ۔ ۔"

مسعود نے ایک نگاہ خاصہ دان کو غور سے دیکھا جو واقعی ان کی باتیں نہیں سُن رہا تھا اور پھر اپنے چچا کو اسی طرح ہوں ہوں کرتے چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچہری کے برآمدے میں بنچ پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھا چپڑاسی آپ ہی آپ کچھ جا رہا تھا "ہوں ! تجھے پیسے دُوں ! تجھے ناداں دُوں ۔ میرے بورے جو ڈھوتا ہے ۔ ہُوں تجھے پیسے دُوں"

اور راستہ بھر مسعود کو ایسی ہی آوازیں آتی رہیں ۔ اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے ٹخنوں کے درمیان چھوٹا سا گراموفون لگا ہوا ہو اور جس کا ریکارڈ اس کی رفتار کے مطابق گھومتا ہو۔ مسعود نے سڑک کے کنارے تیز تیز ہی بھاگنا شروع کر دیا اور ریکارڈ اُونچے اُونچے بجنے لگا "تجھے پیسے دُوں ، تجھے پیسے دُوں ۔ میرے بورے جو میرے بورے جو" مسعود نے گھبرا کر راہ چلتے لوگوں کو

غور سے دیکھا کہ کہیں وُہ بھی تو یہ ریکارڈ نہیں سُن رہے اور پھر اپنی رفتار بالکل سُست کر دی۔ گراموفون کی چابی ختم ہوگئی اور ریکارڈ رِسکنے لگا۔ "تجھے پیسے ۔۔۔۔ دُوں ۔۔۔۔ تجھے نادان ۔۔۔۔ دُوں ۔۔۔۔ میرے ۔۔۔۔ پورے ۔۔۔۔ جو ۔۔۔۔" اور سکول تک یہ باجا یُونہی بجتا رہا۔

سکول بند ہوتے پر گل ریز نے خود ہی اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی کہ طلسماتی کارڈ اپنے کمرے میں لٹکا کر اور سارے دروازے بند کر کے دیکھیں گے کہ گرمی سے دائرہ سُرخ ہوتا ہے کہ نہیں۔ یہ تجسّس مسعود کو کشاں کشاں ان کے گھر لے گیا۔ گول گول غلام گردش والے برآمدے کے ایک کونے میں سفید رنگ کی ساڑھی باندھے ادھیڑ عمر کی ایک دُبلی سی عورت جالی کے دروازے کو دھاگے سے ٹانکے لگا رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا اور کندھوں پر سلیٹی رنگ کی بُنی ہوئی ایک اُونی شال پڑی تھی۔ مسعود نے ایک نظر اس کے ننھے سے جوڑے کو دیکھا جس سے سارا برآمدہ بھرا بھرا معلوم ہوتا اور سیڑھیوں پر ٹھٹک گیا۔ اُسے اس طرح دم بخود دیکھ کر گل ریز نے بے تکلفی سے بستہ چارپائی پر پھینک کر کہا "آؤ۔ آؤ" اور پھر سمینٹ کے فرش پر تیزی سے اپنے بوٹ گھسیٹتا وُہ اس عورت کے پاس جا کھڑا ہوا اور چلّا کر کہنے لگا "امّی امّی! میں نے ایک چیز خریدی۔ ایک نئی چیز، جادُو کا کارڈ ــــــ دیکھو امّی" اور اس کی امّی نے گردن موڑ کر اور کارڈ ہاتھ میں لے کر کہا "اچھّا ہے۔ بڑا اچھّا" اور پھر اس کی نگاہیں برآمدے میں رینگتے ہوئے اس لڑکے پر پڑیں۔ جس نے ٹخنوں سے اُونچی میلی شلوار پہن رکھی تھی اور جس کے خاکی کینوس کے جوتوں سے اس کی انگلیاں باہر جھانک رہی تھیں۔ گل ریز نے شرماتے ہوئے کہا "یہ میرا دوست مسعود ہے امّی۔ یہ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔ یہ میرے ساتھ اس کارڈ کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھنے آیا ہے۔"

امّی اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے غور سے مسعود کو دیکھا۔ خوش آمدید کی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی اور وُہ بڑے پیار سے بولی "تم نے کارڈ نہیں خریدا، مسعود؟"

اور مسعود کو یُوں محسوس ہوا جیسے وُہ اس کی برسوں کی واقف ہو۔ مسعود

اس کے صحن میں کھیل کر اتنا بڑا ہوا ہو اور وُہ مسعود کو لمبی لمبی کہانیاں سُنا کر ہر رات کہا کرتی رہی ہو "اب تم سو جاؤ۔"

گلریز نے اپنے کارڈ کے دائرے پر فخر سے انگلی پھیرتے ہوئے کہا "اُس نے نہیں خریدا امّی - اس کے پاس دونی نہیں تھی - اس کے پاس کبھی بھی پیسے نہیں ہوتے۔"

امّی نے کہا "تُو اچھا دوست ہے - اُس نے نہیں خریدا تو تُو نے دو کارڈ کیوں خرید لیے ؟ تیرے پاس تو پیسے تھے۔"

گلریز نے گھبرا کر جواب دیا "باقی پیسوں کی تو میں نے برفی کھالی تھی اور ایک آنے کی پنسل خریدی تھی -

امّی نے کہا "تو تجھے اپنے دوست سے برفی پیاری ہے۔"

"نہیں جی، امّی!" گلریز شرمندہ ہو گیا اور اپنے دوست کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ کے کمرے میں لے گیا - اس کمرے میں سُرخ رنگ کے صوفے پر ایک لڑکی سویٹر بُن رہی تھی - اس کے پہلو میں چینی کی ایک چھوٹی سی رکابی میں کھیلیں پڑی تھیں - گلریز نے اندر داخل ہو کر کہا "دیکھو، دیدی، دیکھو، میرے پاس جادُو کا کارڈ ہے۔"

اور دیدی نے سلائیوں سے نگاہیں اُٹھائے بغیر کہا "اچھا ہے۔"

مسعود دیدی کا رویّہ دیکھ کر اور با ادب ہو گیا اور گلریز خفیف ہو کر جالی کا دروازہ زور سے چھوڑ کر باہر نکل گیا - دیدی نے ماتھا سکیڑ کر کہا "آہستہ" اور پھر سوالیہ نگاہوں سے مسعود کو دیکھ کر اپنے کام میں مشغول ہو گئی - مسعود نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا - ہولے سے آگے بڑھا - دھیرے سے جالی کا دروازہ کھولا اور اسے بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ بند کرتے ہوئے گلریز کے پیچھے چلا گیا -

اپنے کمرے میں پہنچ کر گلریز نے کارڈ میز پر ڈال کر کہا "دروازہ بند کر دو یار کمرہ گرم ہو جائے گا تو کارڈ رنگ بدلے گا۔"

دروازہ بند ہو گیا - وُہ دیر تک کارڈ پر نگاہیں جمائے بیٹھے رہے مگر اس کا رنگ تبدیل نہ ہوا - مسعود نے کہا "گلریز میاں، گرمی کم ہے - اس لیے رنگ تبدیل نہیں ہوتا - باورچی خانے میں چولھے کے پاس کارڈ رکھیں گے تو یہ ضرور سرخ ہو جائے گا۔"

جب باورچی خانے میں پہنچے تو امّی گوبھی کاٹ رہی تھیں - گلریز نے ایک چوکی چولھے

کے پاس کھینچ کر اس پر کارڈ ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا رنگ ٹماٹر کی طرح سُرخ ہو گیا۔

امّی سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ جب وُہ اسے پھلوں اور بسکٹوں والی چائے پلا کر گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئیں تو باورچی خانے سے چُرائی ہوئی چونّی مسعود کی جیب میں انگارے کی طرح دہکنے لگی اور وُہ جلدی سے سلام کر کے ان کے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس دن کے بعد سے امّی نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور وہ سارا سارا دن ان کے گھر ہی رہنے لگا۔

تقسیم کے بعد جہاں سب لوگ تتر بتر ہو گئے وہاں امّی اور مسعود بھی بچھڑ گئے اور پُورے تین سال بعد آج ان کی ملاقات عید کارڈوں کی دکان پر ہوئی تھی۔

مسعود نے اپنی کوٹھڑی تو نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ دفتر کے بعد کا تقریباً سارا وقت امّی کے یہاں گذارنے لگا۔ دیدی نے واقعی ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا اور وُہ پہلے سے زیادہ متکبر ہو گئی تھی۔ بریکٹ پر ایک بڑے سے پھول دان میں وہ سرکنڈوں کے پھول لگائے موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتی۔ اس کی آواز جو پہلے نرگس کے ڈنٹھل کی طرح ملائم تھی خشک اور کھُردری ہو گئی تھی۔ یُوں تو وُہ دن بھر میں مشکل سے ہی چند جُملے بولتی لیکن جب بات کرتی تو یُوں لگتا گویا خشک اسفنج کے ٹکڑے اُگل رہی ہو امّی جب بھی اس سے بات کرتی بڑے ادب اور رکھ رکھاؤ سے کام لے کر واقعی دیدی نے ایم۔ اے کا امتحان دے دیا تھا۔

امّی نے کئی مرتبہ مسعود سے اس کی اماں اور چچا کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کبھی کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ "نہیں کہیں رہتے ہیں۔ مجھے علم نہیں۔"

دفتر سے فارغ ہو کر مسعود سیدھا امّی کے یہاں پہنچتا اور رات کو دیر تک اِدھر اُدھر کی بے معنی گپیں ہانکتا رہتا۔ دیدی کوئی کتاب پڑھ رہی ہوتی۔ وہ دو تین مرتبہ تیز تیز نگاہوں سے امّی اور مسعود کو گھورتی اور پھر جھٹ سے کتاب بند کر کے اندر کمرے میں چلی جاتی۔ جب دیدی مسعود کی پہنچ سے باہر ہو جاتی تو وُہ زور زور سے قہقہے لگا کر اس کی پڑھائی میں مخل ہونے لگتا۔ امّی کو پتہ تھا کہ وُہ جان بُوجھ کر دیدی کو تنگ کر رہا ہے لیکن اس نے کبھی بھی مسعود کو منع نہیں کیا۔ ایک رات جب اسے باتیں

کرتے کرتے کافی دیر ہو گئی تو امّی نے کہا "اب یہیں سو رہو۔ اس وقت اتنی دُور کہاں جاؤ گے۔" تو مسعود وہیں سو رہا اور اس رات کے بعد وُہ مستقل طور پر اُسی کے یہاں رہنے لگا۔

چچا کی بخیل فطرت اور ماں کی لاپروائی اس کی آزادانہ زندگی پر ایک عجیب طرح سے اثر انداز ہوئی۔ وُہ پہلے جس قدر گم سُم رہتا تھا اب اُسی قدر منہ زور ہو گیا تھا اور اپنے بچپن کی غریبی کا مداوا کرنے کے لیے اُس نے جوا کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی وُہ تنگ و تاریک کوچوں میں سے گذرتا ہُوا اس اندھی گلی میں پہنچ جاتا جس کے آخر میں پُرانے چھپّر اور پھُونس کے ڈھیر پڑے ہوتے۔ پھُونس کو ایک طرف ہٹا کر مسعود اندھیرے بھٹ میں داخل ہوتا۔ جس کے پیچھے کچّی اینٹوں کی ایک غلیظ سی کوٹھڑی کڑوے تیل کا دیا اپنے آغوش میں لیے اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ چیتو، بھمبیری اور مغلن نشہ پانی کیے فرش پر لیٹے ہوتے اور دریاں چھوٹے سے دروازے کے ٹوٹے ہوئے پٹ سے پشت لگائے ہوئے سے کہتی "آ گیا، راجہ نل آ گیا" اور پریل شروع ہو جاتی۔ مسعود کا ذہن اور مقدر مل جُل کر ایسے ایسے معرکے مارتے کہ ہارنے کی نوبت کم آتی اور جب تک مسعود کی جیبیں بالکل خالی نہ ہو جاتیں اُسے کل نہ پڑتی۔ وُہ تاش پھینٹے جاتا۔ نقدی کی ڈھیریاں لگائے جاتا اور پریل کھیلے جاتا حتیٰ کہ اُس کے مخالفوں کے پاس ایک چھدام بھی نہ رہتا یا اس کی جیبوں کا استر مُردہ گائے کی زبان کی طرح باہر لٹکنے لگتا۔

امّی کو پتہ تھا کہ مسعود نوکر ہو کر بڑا ہی زندہ دل اور چُست ہو گیا ہے لیکن اس بات کا اسے علم نہ تھا کہ پریل کھیلتے ہوئے اُس کی انگلیاں بھی قینچی کی طرح چلنے لگی ہیں۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو امّی اس کا بستر بچھا کر آدھی رات تک اس کا انتظار کرتے ہوئے سوچا کرتی کہ گل ریز بھی یونہی آوارہ گردی کرتا ہو گا اور اس کی لینڈ لیڈی اس کا انتظار اسی طرح کیا کرتی ہو گی۔ پھر مسعود اور گلریز آپس میں گڈمڈ ہو جاتے۔ امّی اور لینڈ لیڈی ایک دوسری میں مدغم ہو جاتیں اور شفقت لاابالی کا انتظار کرنے لگتی۔ ڈیڈی اپنے بستر پر ایک دو مصنوعی کروٹیں بدل کر آتش باز نگاہوں سے امّی کو گھورتی اور پھر منہ دوسری طرف کر کے دم سادھ لیتی۔

مسعود جب پھاٹک کے قریب پہنچتا تو پنجوں کے بل چلنے لگتا۔ شور مچانے والے پٹ کو آہستہ سے دھکیلتا اور پھر اندر داخل ہو کر اُسے اُسی طرح بند کرنے لگتا کہ امی پکار کر پوچھتی۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"کہیں سے نہیں امی۔" وہ سہم جاتا۔

"تو تم کہیں تھے؟" امی غصے سے پوچھتی۔

"نہر پر دوستوں کے ساتھ گپیں مار رہا تھا۔"

"یہ تمھارے کون سے ایسے دوست ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔"

"میرے دفتر کے ساتھی ہیں، امی۔ دفتر کی باتیں ہو رہی تھیں۔" اور وہ آرام سے آکر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور اپنے بوٹ کھولنے لگتا۔ امی خاموشی سے اُٹھ کر اندر آجاتی اور کٹ کیٹ کا پیکٹ اس کے بستر پر پھینک کر بے پروائی سے کہتی "میں آج بازار گئی تھی اور تیرے لیے یہ لائی تھی۔ آدھی اپنی دیدی کے لیے رکھ لینا۔"

اور جب وہ بستر پر لیٹنے لگتا تو امی کہتی "یہ تو اپنے بالوں میں اتنا تیل کیوں تھوپ لیتا ہے۔ لے کے سارے تکیے تیلی کی صدری بنا دیے ہیں۔ صبح ہونے دے تیرے سر پر اُسترا پھرواتی ہوں۔"

اور مسعود کوئی جواب دیے بغیر سفید چادر اوڑھ کر مُردے کی طرح سیدھا شہتیر لیٹ جاتا تو امی جل کر کہتی "تجھے کتنی مرتبہ کہا ہے یوں نہ لیٹا کر۔ یا تو کروٹ بدل یا ٹانگوں میں خم ڈال۔ اس طرح لیٹنے سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

مسعود کروٹ بدل کر سو جاتا اور لینڈ لیڈی اطمینان کی سانس لے کر لباس تبدیل کرنے چلی جاتی۔

امی گل ریز کا ہر خط مسعود کو ضرور دکھاتی اور پھر اتنی مرتبہ اس سے پڑھوا کر سنتی کہ مسعود کو اُلجھن ہونے لگتی اور وہ خط پھینک کر باہر چلا جاتا۔ گلریز کے ہر خط میں یا تو روپوں کا مطالبہ ہوتا یا گرم کپڑوں اور دیگر معمولی معمولی چیزوں کا جن کا بندوبست امی بڑے انہماک سے کیا کرتی۔ پارسل بھیجے جاتے۔ ان پر لاکھ کی مُہریں لگتیں اور پھر مسعود کو اُنھیں ڈاک خانے لے جانا پڑتا۔

تنخواہ ملنے میں ابھی کئی دن پڑے تھے۔ جمبیری مسعود کو سڑک پر مل گیا۔ اس نے

بتایا کہ ان کی چوکڑی میں ایک بڑا مال دار کباڑیا ٹرکنا داخل ہو گیا ہے جو صرف ہزاروں کی بازی لگاتا ہے۔ مسعود کے استفسار پر جھمیری نے بتایا کہ وہ ہر روز اپنے ایک گماشتے لالو کانے کے ساتھ گپھا میں آتا ہے اور نشہ پانی کر کے چلا جاتا ہے۔ مسعود نے ڈاک خانے کے پچھواڑے جا کر گرم سوٹ کا پارسل کھولا اور ماسٹر غلام حسین کی دکان پر جا کر ڈیڑھ سو روپے میں بیچ دیا۔ اس رات وہ گھر نہیں گیا۔ اس کا بستر تمام رات ٹھنڈا رہا اور اس کی پائنتی پر پڑی ہوئی سفید چادر امی کی طرح ساری رات اس کا انتظار کرتی رہی۔ صبح جب وہ گھر پہنچا تو نہ اس کے پاس روپے تھے اور نہ پارسل کی رسید۔ امی نے رات بھر غائب رہنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیے بغیر اس سے پوچھا "پارسل کروا دیا تھا؟"

"کروا دیا تھا۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"اور رسید؟" دیدی نے پوچھا۔

مسعود نے گھور کر دیدی کو دیکھا اور کہا "رات میں جس دوست کے یہاں سویا تھا رسید وہیں رہ گئی۔"

امی نے چائے کی پیالی بناتے ہوئے پوچھا "چھ روپے میں کام بن گیا تھا؟"

"نہیں" مسعود نے آہستہ سے کہا "ساڑھے سات روپے کے ٹکٹ لگے۔ میں نے ڈیڑھ روپیہ ادھار لے لیا تھا۔" اور ڈیڑھ کا لفظ آتے ہی چائے اس کے حلق میں پھنس گئی۔

مسعود کو معلوم تھا امی کی تنخواہ تین چار سو کے لگ بھگ ہے۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ ایک پارسل کے نہ پہنچنے سے وہ مر نہیں جائے گی۔

ایک دن جب دیدی کے ڈریسنگ ٹیبل سے پچیس روپے گم ہو گئے تو اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس نے بلا سوچے سمجھے امی سے کہہ دیا کہ یہ کارستانی مسعود کی ہے۔ امی بجائے خفا ہونے کے رو کر کہنے لگی "آج تو مسعود پر الزام دھرتی ہے کل مجھے چور بنائے گی ـــــ وہ بھلا تیرے پیسوں کا بھوکا ہے؟"

لیکن دیدی نہ مانی اور ماں بیٹی میں خوب خوب تکرار ہوئی۔ شام کو نہ امی نے کھانا کھایا اور نہ دیدی نے۔ لیکن اس رات مسعود کا پانسہ بھاری رہا اور اس نے

اپنے ساتھ ببیری اور جیتو کو بھی نان کباب کھلائے۔

گلریز کا خط آ گیا تھا کہ اُسے پارسل نہیں ملا۔ ڈاک خانے میں پوچھ گچھ ہوئی۔ رسید کی ڈھنڈیا پڑی لیکن نہ رسید ملی نہ پارسل کا پتہ چلا اور امّی ڈاک خانے کو پیٹ کر خاموش ہو رہی۔ لیکن اس مرتبہ نہ تو اُس نے گلریز کا خط مسعود کو دکھایا اور نہ ہی اس سے پڑھوا کر سُنا۔ اس نئے رویّے نے مسعود کو یونہی تجسّس میں ڈال دیا۔ اس نے ایک دو مرتبہ امّی سے خط کے بارے میں پُوچھا بھی لیکن وُہ یہی کہہ کر خاموش ہو گئی کہ "میں کہیں ڈال کر بھول گئی ہوں" خط گھر ہی میں تو تھا، جاتا کہاں، مسعود کی تفتیش نے اسے امّی کی میز سے ڈھونڈ نکالا۔ گل ریز نے لکھا تھا "پارسل مجھے نہیں ملا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ یہاں سردی بڑھتی جا رہی ہے اور میں سخت پریشان ہوں۔ لیکن سب سے بڑی پریشانی روپے کی ہے۔ مجھے نئی کلاس میں داخلہ لینا ہے جس کے لیے مجھے کم از کم دو ہزار روپوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن امّی تم یہ دو ہزار روپیہ کہاں سے لاؤ گی۔ مجھے علم ہے تمھارے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ پر میں کروں بھی تو کیا! تعلیم ادھوری چھوڑ کر ایک ہی ڈگری لے کر آ جاؤں؟" . . . . .

اس کے آگے مسعود نے کچھ نہ پڑھا۔ خط تہ کیا اور دراز میں رکھ کر دفتر چلا آیا۔ اسے امّی کی تنخواہ کے بارے میں علم تھا اور اس کے اندوختہ کے متعلق بھی اندازہ تھا لیکن گلریز کے اس خط نے اس کے سارے اندازوں پر پانی پھیر دیا۔ سارا دن وُہ بے شمار ننھے ننھے سوالوں میں گھرا ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا اور آخر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ امّی نے گلریز کو بھی دھوکے میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ وُہ غیر ملک میں عیاشیوں پر نہ اُتر آئے۔

شام کو وُہ معمول سے پہلے گھر پہنچ گیا۔ پھاٹک پر تانگہ کھڑا تھا۔ دیدی کہیں باہر گئی ہوئی تھی اور امّی اندر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ مسعود دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ امّی اپنے بڑے سیاہ ٹرنک سے زیور نکال نکال کر انھیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی اور پھر اپنے پرس میں ڈالے جاتی۔ ٹرنک بند کر کے اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے سنہری انگوٹھی اتار کر بھی اسی پرس میں ڈال لی۔ جب وُہ اُٹھ کر چلنے لگی تو مسعود نے اندر داخل ہو کر کہا "کہاں کی تیاری ہو رہی ہے؟"

امّی گھبرا گئی۔ اُس نے مصنوعی مسکراہٹ سے کام لیتے ہوئے کہا "اچھا ہی

ہوا تم آ گئے۔ میں بازار جا رہی تھی۔ تھوڑا سا کپڑا خریدنا ہے۔ تم گھر پر ہی رہنا۔ تمھارے لیے کٹ کیٹ لاؤں گی۔"

مسعود نے کہا "امی ہمیں تو آج اس لیے جلدی چھٹی ہو گئی ہے کہ ہمارے دفتر کی ٹیم ریلوے کلب سے فٹ بال کھیل رہی ہے اور میں چھاؤنی جا رہا ہوں۔ میں گھر پر رہ کر کیا کروں گا۔ دینو جو یہاں موجود ہے۔"

امی نے کہا "اسے میں ساتھ لیے جا رہی تھی۔ لیکن خیر اب وہی گھر پر رہے گا۔ —— تم چائے پی لینا۔ تمھارے لیے انڈے اُبال کر میں نے تھرموس میں رکھ دیے ہیں۔"

امی چلی گئی۔ مسعود نے اپنا کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور خود کرسی پر دراز ہو کر اخبار دیکھنے لگا۔ دینو چائے تپائی پر رکھ کر تسا کو لینے چلا گیا۔ مسعود نے اسی طرح اخبار گود میں ڈالے ایک پیالی پی۔ تھرموس کھول کر ایک انڈا نکالا اور بغیر نمک لگائے کھا گیا۔ —— —— دینو کو بازار گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کے لوٹ آنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا۔ مسعود اُٹھا۔ دیدی کے ٹرنک سے کروشیا نکالا اور امی کے کمرے میں جا کر اٹیچی کیس کھولنے لگا۔ اُدھر ہی قرمزی رنگ کی ایک ریشمی ساڑھی کی تہ میں پچاس روپے پڑے تھے۔ روپے اٹھا کر اُس نے جیب میں رکھ لیے اور پھر تالا بند کرنے لگا۔ لیکن زنگ آلود پھاٹک کے کھلنے سے وہ چونک پڑا اور گھبراہٹ میں کروشیا بھی جیب میں ڈال کر باہر آ گیا۔ مسعود نے دینو کو گھورتے ہوئے پوچھا "اتنی دیر کر دی۔ کہاں چلا گیا تھا؟"

"جانا کہاں تھا؟" دینو نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "بنا بنایا تسا کو دکاندار کے پاس تھا نہیں۔ میں اگلی دکان پر گڑ لینے چلا گیا۔"

"اچھا" مسعود نے بے پروائی سے کہا "امی سے کہہ دینا میں ذرا دیر سے آؤں گا اور کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

یہ کہہ کر مسعود چلا گیا اور دینو نے پھاٹک بند کر دیا۔

سپرنٹنڈنٹ کے یہاں پہنچ کر مسعود نے اپنے چہرے پر مسکینی کے ایسے آثار پیدا کیے کہ وہ پسیج گیا اور اس نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر ڈیڑھ سو روپیہ لا کر مسعود کو دے دیا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہنے لگا "مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ دو

سو روپے اِس وقت میرے پاس نہیں ۔ شاید یہ رقم تمہاری والدہ کو موت کے مُنہ سے بچا سکے ۔" اور جب مسعود اُٹھ کر جانے لگا تو سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔" جنرل وارڈ کے انچارج ڈاکٹر قدیر میرے واقف ہیں ۔ کہو تو انھیں ایک رقعہ لکھ دوں ۔"

مسعود نے تشکر آمیز لہجے میں کہا ۔" اگر ایسا کر دیجیے تو میری دُنیا بن جائے ۔ خواجہ صاحب ، میرا اس جہاں میں سوائے میری ماں کے اور کوئی نہیں ۔"

سپرنٹنڈنٹ نے تسلی دیتے ہوئے کہا ۔" گھبرانے کی کوئی بات نہیں ، تمھاری والدہ راضی ہو جائے گی ۔"

اور جب مسعود رقعہ لے کر بنگلے سے نکلا تو رات چھا چکی تھی اور سڑکوں کی بتّیاں جل رہی تھیں ۔ اُس نے ایک ٹانگہ کرایہ پر لیا اور سڑکوں پر یُونہی بے مقصد گھومتا رہا ۔ نوبہار ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا اور پھر ریلوے اسٹیشن پر چلا گیا ۔ شرفاد کے کمرے میں جا کر اُس نے ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور دیر تک آہستہ آہستہ چائے پیتا رہا ۔ جب وُہ اسٹیشن سے نکلا تو نو بج چکے تھے ۔ اس نے ٹانگہ باغ کے قریب چھوڑ دیا اور پیدل چلنے لگا ۔ سڑکوں کی چہل پہل کم ہونے لگی ۔ سیر کرنے والوں کی ٹولیاں باغ سے نکل کر خراماں خراماں گھروں کو جا رہی تھیں ۔ چوراہوں کے سنتری جا چکے تھے اور سینماؤں کے سامنے کی رونق اندر ہال میں سمٹ گئی تھی ۔ مسعود نے اندھیری گلی میں داخل ہو کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر پولیس اُٹھا کر کھپا میں داخل ہو گیا ۔ ریاں نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور سُلفہ بھرے سگریٹ کا دم لگا کر بولی ۔" آگیا ۔ راجہ نل آگیا ۔"

رُکنے کباڑیے نے کھنکار کر کہا ۔" آنے دو ۔ آگے کون سے ننگ بیٹھے ہیں ۔"

لالو نے اپنی کانی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔" لال اوئے ۔ پہلی تاریخ سے پہلے کیسے درشن دیے ۔ ابھی تو چاند چڑھنے میں کافی دیر ہے ۔"

مسعود مسکرا کر خاموش ہو رہا ۔

چینو نے کہا ۔" لے بھمبیری ، چاند مکھن ، چاند ہیرا ۔ چاند چڑھ گیا چڑھ گیا ، نہ چڑھا نہ چڑھا ۔ نشہ جو ہُوا ۔"

اس پر سب ہنسنے لگے ۔

جب مسعود جُوتا اُتار کر دری پر بیٹھ گیا تو رُکنے نے پوچھا ۔" پھر کُچھ ہو جائے

چھوٹی سی بازی ہے؟

"ارے واہ، چھوٹی کیوں لالا" کانے نے کہا۔ "بازی ہو تو اگڑبم ہو نہیں تو نہ سہی۔"

رُکنا بولا۔ "ہم تو اگڑبم ہی کھیلتے ہیں۔ لیکن بابو ذرا نرم ہے۔ اس لیے لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

لالو کانے کو یہ بات بہت بُری لگی۔ اُس نے کہا "شرع میں کیا شرم۔ بازی میں کیا لحاظ۔ بازی وُہ جس میں چمڑس ہو جائے۔"

مسعود نے کوئی جواب دیے بغیر دو سو کے نوٹ نکال کر دری پر رکھ دیے اور چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ دیے کی لو اونچی کر دی گئی اور بازی شروع ہو گئی۔ آخری تیا دری پر پھینک کر مسعود نے رُکنے کے آگے سے دو سبز نوٹ اُٹھا کر اپنے نوٹوں پر رکھ لیے اور اُنھیں آگے دھکیل دیا۔

ریباں نے گردن پھیر کر کہا "تیرے صدقے، انگوٹھی بنوا دے۔"

ڈھلن نے ڈکار لے کر کہا "تیرے صدقے، کنوئیں لگوا دے۔ اُلٹا لٹک کر مالک سے مِلوں گا۔"

رُکنے کباڑیے نے صدری سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے اور جھلّا کر لالو سے کہنے لگا "کانے بمبر پنکھا تو کر، گرمی سے جان نکل رہی ہے۔"

کانا بمبر پنکھا کرنے لگا تو مسعود نے ہاتھ سے اشارہ کر کے آہستہ سے کہا "ذرا ہولے۔ دِیا نہ بُجھ جائے۔"

اور بازی پھر شروع ہو گئی۔

دیدی بستر پر بے معنی سی کروٹیں بدل رہی تھی اور اس کے قریب آرام کرسی میں دراز امی چُپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے وہی تپائی تھی جس پر مسعود چائے پی کر گیا تھا اور اب اس تپائی پر امی کا پرس اور کٹ کیٹ کا ایک پیکٹ پڑا تھا۔ دیدی جاگنے میں بڑبڑا رہی تھی اور امی خاموشی سے اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سُن رہی تھی۔

بازی ختم ہو گئی اور مسعود نے رُکنے کے چار سو سمیٹ کر اپنے نوٹوں میں مِلا

لیے۔ کاکے نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے رُکنے کو دیکھا اور بولا "لالا!"

رُکنے نے کہا "پھر کیا ہوا؟ ابھی تو بڑی مایا ہے۔ بالو کو جی بہلانے دے۔" اور اُس نے دو سو کے نوٹ نکال کر آگے رکھ لیے۔

مسعود نے کہا "یوں نہیں۔ تخت یا تختہ" اور پھر سارے نوٹ آگے ڈھکیل دیے۔

رُکنے نے کہا "یُوں تو یُوں سہی" اور چھ اور سبزے نکال کر اگلے نوٹوں پر ڈال دیے۔ تاش کے پتّے پھر انگلیوں میں ناچنے لگے۔

امّی نے چور آنکھ سے دروازے کی طرف دیکھا اور ہولے سے کہا "ابھی تک آیا نہیں، پتہ نہیں کیا وجہ ہے۔" پھر اس نے کٹ کیٹ کے پیکٹ کو انگلی سے دبا کر دیکھا جو گرمی کی وجہ سے ذرا لجلجا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر امّی نے کٹ کیٹ کے پیکٹ پر چھڑکا اور پھر کرسی پر دراز ہو گئی۔ ڈیڈی نے قہر آلود نگاہوں سے امّی کو دیکھا اور پھر کروٹ بدل لی۔

آخری پتّہ پھینکنے سے پہلے مسعود نے رُکنے کے نوٹ پھر اُٹھا لیے اور پتّہ چوم کر اس کی گود میں پھینک دیا۔ لالو کانا دم بخود دیکھا کیے جا رہا تھا۔ چینو، ڈھلن اور جھمیری فرش پر سوئے ہوئے تھے اور ریباں دیوار کے ساتھ لگی اُونگھ رہی تھی۔

رُکنے نے لالو کی طرف دیکھا اور شرمندگی ٹالنے کے لیے دو نوٹ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے۔ مسعود نے کہا "بس دو سو! کوٹھی اور جیب دیکھ، لالا۔ شاید اس میں سبزے پڑے ہوں۔"

لیکن رُکنا کوٹھی اور جیب دیکھنے پر رضامند نہ ہوا۔ لالو کانا بولا "کل سہی بابو۔ بولتی بند ہو جائے گی۔ لے یہ ایک دس روپے کی گرمجس یاروں کی بھی رہی۔" اور اُس نے رُکنے کے دو سو پر دس اور رکھ دیے ۔۔۔ تاش بانٹی جانے لگی۔

امّی نے ڈیڈی کے سرہانے تلے ہاتھ پھیر کر اس کی گھڑی نکالی اور اپنے آپ سے کہا "ایک بج گیا!"

پھاٹک ذرا سا ہلا۔ امّی تیز تیز قدم اُٹھاتی اُدھر گئی۔ اس نے بلٹ کھولنے سے پہلے چوڑی دراز میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ایک خارش زدہ کتّا پھاٹک کے ساتھ اپنی کمر رگڑ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر آ کر پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔

بازی ختم ہو گئی اور مسعود نے دو سو دس روپے اُٹھا کر اپنے نوٹوں میں شامل

کر لیے اور رُکنے سے پوچھا" اور؟" رُکنے نے معنی خیز نگاہوں سے لالو کو دیکھا اور منہ پونچھ کر بولا "بس!"

نوٹوں کی گڈی بنا کر مسعود نے سامنے کی جیب میں ڈال لی۔ جوتا پہن کر کھڑا ہو گیا اور سوئے ہوئے بیچاروں پر نگاہ ڈال کر بولا "اچھا، استاد، پھر سہی پہلی تاریخ کو۔"

رُکنے اور لالو نے کوئی جواب نہ دیا اور مسعود خاموشی سے چل دیا۔ پھونس سے گذر کر اُس نے تازہ ہوا میں ایک لمبا سانس لیا اور اندھیرے کی گود میں مُڑتی ہوئی بے جان گلی کو دُور تک محسوس کیا۔ پھر وہ اپنے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ یہ تو کُل اٹھارہ سو ہوئے اور گلریز نے دو ہزار مانگے ہیں۔ باقی دو سو کا بندوبست کیونکر ہو گا اور وہ ابھی ان باقی دو سو کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے گلے میں صافہ ڈال کر اسے زمین پر گرا دیا۔ گرتے ہی ایک تیز دھار چاقو کا لمبا پھل اس کے سینے سے گذر کر دل میں اُتر گیا۔

ایک آواز نے کہا "کانے ہمبڑ یہ کیا کیا ــــ نوٹ نکال نوٹ۔"

کانے ہمبڑ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالنے کی کوشش کی مگر چاقو کا پھل نوٹوں کو پروتا ہوا پسلیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اُس نے زور لگاتے ہوئے کہا۔ "لالا نکلتے نہیں۔" اور جب لالا نوٹ نکالنے کو جھکا تو گلی کے دہانے پر سپاہی سیٹیاں بجانے لگے اور وہ دونوں مسعود کو یونہی چھوڑ کر بھاگ گئے۔

مسعود نے زور لگا کر چاقو باہر نکالا اور اسے پرے پھینک۔ پھر اس نے خون آلودہ نوٹوں کی گڈی جیب سے نکالی اور اُٹھنے کی کوشش کی مگر وُہ اُٹھ نہ سکا۔ پیٹ کے بل لیٹ کر اُس نے نوٹ دائیں ہاتھ میں پکڑ لیے اور اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ کہنی کو زمین پر دبا کر اُس نے آگے گھسٹنا چاہا لیکن جونہی کہنی اُس کے پہلو سے آکر لگی اس کا ماتھا زمین سے جا ٹکرایا اور اس کی جیب سے ایک کروشیا نکل کر باہر گر پڑا۔ مٹھی میں پکڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اُس نے کہا "امی . . . . . جی . . . . . میں . . . . . امی . . . " لہو کی آخری بُوند زمین پر گری اور اس کی مٹھی ڈھیلی ہو گئی۔

امی نے ٹھنڈے پانی میں انگلی ڈبو کر ایک قطرہ کٹ کیٹ پر ٹپکاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا "ابھی تک آیا نہیں!"